ستمبر ۱۹۶۵ء

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

نگار پاکستان

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

ماجدولین نمبر

فرانسیسی ادب لطیف کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دلدوز تاریخی رومان جس کی نظیر کسی زبان کے
ادب میں آپ کو نظر نہ آئے گی!!

اسے پہاڑوں نے سنا اور کانپ اٹھے

★ زمین نے سنا اور تھرا اٹھی ★ خدا نے سنا اور تادیر ملول رہا۔ اف رے

جسے روح سنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کر نئی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے۔

محبت کا خراج

صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے امنڈتے اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں۔

اور ممکن نہیں

یہ سانحہ پڑھ کر آپ یہ خراج ادا کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔

قیمت: تین روپے

نگار پاکستان ★ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ★ کراچی ۳

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ

مومن نمبر

(مرتبہ:۔ نیاز فتحپوری)

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو **شیخِ حرم** بھی ہے اور **رندِ شاہد باز** بھی، اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔ یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہلِ ذوق کیلئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اسکا صحیح اندازہ

"مومن نمبر"

کے مطالعہ سے ہوگا،

اس نمبر میں مومن کی سوانح۔ حیاتِ معاشقہ۔ اس کی غزل گوئی۔ قصیدہ نگاری مثنویات و رباعیات اور خصوصیاتِ کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہوگیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کرکے **مومن** پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے ٭ قیمت:۔ چار روپے

منیجر **نگارِ پاکستان** ٭ ۳۲ ٭ گارڈن مارکٹ ٭ کراچی ۳

گردشِ مدام

روپیہ گردش میں رہتا ہے۔ روپیہ کو گردش میں رہنا چاہیے۔
سوال صرف اتنا ہے کہ جب یہ دست بدست آپ تک پہنچا
تو آپ نے اسے کس طرح استعمال کیا۔
سیونگ اکاؤنٹ سے روپیہ کی صحت مند گردش جاری رہتی ہے۔
آج ہی سیونگ اکاؤنٹ کھول کر اپنے بچوں کے لئے ایک
قابلِ تقلید مثال قائم کیجیے کہ
بچت آپ کے اور ان کے مستقبل کی ضامن ہے۔
صرف پانچ روپیہ سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔

دی مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس کراچی — ایس مصطفےٰ اسمٰعیل جنرل منیجر

JWT-65 MCB-52

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲ ٹیلیفون نمبر ۴۴۶۹۳

ستمبر ۱۹۶۵ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

نائب مدیر

ڈاکٹر فرمان فتحپوری عارف نیازی

زر سالانہ
دس روپے

قیمت فی پرچہ
پچھتّر پیسے

صدر دفتر: نیاز منزل۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

شاخ: ۳۲۔ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/ ایف یو پی ۳۶۶۹ – ۶۲/۶۸۔ محکمہ تعلیم کراچی

پبلشر۔ ایم عارف نیازی نے مشہور آفسٹ پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا۔

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگیا

فہرست

۴۴ واں سال | ستمبر ۱۹۶۵ء | شمارہ (۹)

ملاحظات	نیاز فتحپوری	۳
میر لکھنؤ میں	محمد انصار اللہ نظر	۶
خلیل مطران	ظہور احمد	۱۴
لکھنؤ میں اردو	محمد باقر شمس لکھنوی	۳۰
چالیس کی اہمیت	نیاز فتحپوری	۳۸
مانی	پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی	۴۱
حالی غزل گو کی حیثیت سے	سعادت نظیر	۵۲
میری نعتیہ غزل	مولانا ماہر القادری	۵۷
تھیٹر اسٹیج اور تمثیل کے آغاز کی دلچسپ داستان	نیاز فتحپوری	۶۹
باب الاستفسار	نیاز فتحپوری	۷۲
منظومات	فضا ابن فیضی ۔ دانش فرازی تابش شجاع آبادی ۔ شہباز صدیقی	۷۴
مطبوعات موصولہ	ادارہ	۷۸

ملاحظات

گاہے گاہے باز خواں!

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بہتر زمانہ کونسا تھا تو میں بھی بلاتامل عہد نبوی کا نام لے دوں گا۔ لیکن اس کا تعلق نہ رسول اللہ کی ذات سے ہوگا نہ ان کے دیدار سے بلکہ صرف اس روح سے جو اس انسان کامل نے پیدا کی اور اُس عزم و ارادہ سے جس نے ایک پست و جاہل قوم کو دفعتہً قعرِ مذلت سے نکال کر بام ترقی پر پہونچا دیا۔

یقیناً رسول اللہ نے توحید کا درس دیا لیکن اس سے مراد محض خدا کو ایک کہنا یا سمجھنا نہ تھا کیونکہ صرف یہ عقیدہ انسانی ترقی یا فلاح کو مستلزم نہیں بلکہ اس سے مراد ایک عام جذبۂ اتحاد و اخوت کو بیدار کرنا تھا، تمام نوعِ انسانی کو ایک سررشتۂ اجتماعیت سے وابستہ کرنا تھا اور اُس قوت برتر و اعلیٰ میں ضم ہوکر جو یقیناً ہر ہر ذرہ میں کارفرما ہے۔ ایک ایسی جمیل فضا پیدا کر دینا تھا جہاں خدا سمٹ کر انسان اور انسان پھیل کر خدا بن جاتا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ نے کفر و بُت پرستی کے خلاف پوری جد و جہد سے کام لیا لیکن کفر سے مراد خودی کا انکار تھا انانیت کبریٰ سے اعراض تھا اور بت پرستی نام تھا اس کورانہ تقلید یا جاہلانہ سرنگونی کا جو ایک انسان سے احساس انسانیت و برتری چھین لینے والی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ سرکار نبوت سے طاعت و عبادت کی بھی ہدایت کی گئی لیکن اس کا مطمح نظر صرف اس قوت کو سراہنا تھا جو نظام کائنات کو تکمیل و تجمیل کی طرف لے جارہی ہے اور اس سے کسب فیضان کرکے خود اس قوت کا دست و بازو بن جانا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سر ٹیک دینے سے نہ خدا کے مرتبہ میں کوئی بلندی پیدا ہوسکتی ہے اور نہ اس عجز و فروتنی کی اسے ضرورت۔

الغرض یہ بالکل صحیح ہے کہ عہد نبوی بہترین زمانہ تھا لیکن اس کا تعلق نہ صرف روزہ و نماز سے تھا نہ ظاہری مراسم نمائش و عبودیت سے، نہ زبانی تسبیح و تہلیل سے اسے کوئی واسطہ تھا، نہ مسواک و مصلیٰ سے بلکہ وہ ایک زمانہ تھا جس نے سوتی ہوئی انسانیت کو جگایا جس نے فطرت کے قوائے کامنہ کو انسان کے لئے بے نقاب کیا اور جس نے نوامیس الٰہیہ کو دسترس انسانی سے قریب تر کرکے عالم کی ذہنیت کا رُخ بدل دیا۔

پس یقیناً وہ عہد نہایت مبارک عہد تھا جب آفتاب حقیقت نے اول اول طلوع کیا..... اور لاریب وہ زمانہ سراہے جانے کے قابل ہے جب شاہد مقصود سب سے پہلے برافگندہ نقاب سامنے آیا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس ابتدا کو کسی انتہا کی ضرورت نہ تھی۔ یہ آغاز انجام سے بے نیاز تھا۔ اس آفتاب کا طلوع نصف النہار

سے مستغنی تھا۔ تو یقیناً اس کا دعویٰ غلط ہوگا، کیونکہ دنیا کا کوئی تخم دفعتہً بار آور نہیں ہو سکتا کوئی تعمیر فوراً استوار نہیں ہوتی اور منزل تک پہنچنے کے لئے قطع سفر ضروری ہے۔ رسول اللہ نے بے شک انسانیت کے دور جدید کی بنیاد قائم کی لیکن اس توقع کے ساتھ کہ آیندہ نوع انسانی اس کو عروج و کمال تک پہنچائے اور خدا کا وہ وعدہ جو جنات عدن" کی صورت میں کیا گیا تھا پورا ہو کر رہے۔

پھر اب دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ کس قوم نے اس رمز کو سمجھ کر اُن مدارج استعلاء کو حاصل کیا جو ایک سچے مومن و مسلم کے لئے مخصوص ہیں اور وہ کونسی قوم ہے جو اس تعلیم کو نظر انداز کر کے "ہل یہلک الا القوم الفاسقون" کی تعزیر میں مبتلا ہوئی۔

یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ ہم خدائی فیصلوں اور ربانی اصول میں ملک و ملت، رنگ و نسل، کفر و اسلام کی تفریق کو سامنے رکھ کر خطا و صواب کا معیار قائم کرتے ہیں۔ جو فطرت مشرق میں جلوہ گر ہے وہی مغرب میں ہے، قدرت کی جو کارفرمائیاں شمال میں نظر آتی ہیں وہی جنوب میں بھی ہیں۔ شاہراہ صرف ایک ہی ہے جس کا دوسرا نام دین فطرت ہے اور یہ سب کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہے یہود و نصاریٰ کافر و مسلمان کی تفریق صرف ہماری بے بصری کا نتیجہ ہے اور یہ نام وہ ہیں جو خدا کی لوح محفوظ یعنی صحیفۂ قدرت کے اوراق میں کسی جگہ نظر نہیں آتے، وہاں ان سب کو صرف ایک ہی نام لفظ "انسان" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے لئے صرف ایک ہی پہچان "کل مولود ولد علی فطرۃ الاسلام" کی بتائی گئی ہے اور یہ فخر صرف بانی اسلام ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی نے اس راز کو ظاہر کیا اور اس طرح اس نے اول اول جملہ افراد نوع انسانی کو ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کی تعلیم دی لیکن ہماری کوتاہ فہمیوں کی یہ داستان کتنی دردناک ہے کہ جس قوم پر سب سے پہلے اس راز کا افشا کیا گیا اسی نے سب سے زیادہ اس کو ٹھکرایا اور انسانیت کو جس جماعت سے سب سے زیادہ "توقع داد پانے" کی تھی وہی سب سے زیادہ "خستۂ تیغ ستم" نکلی۔

اب سے اربوں سال قبل جب کرۂ ارض کی تخلیق ہوئی تھی ہر چند وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اس کے شباب و بلوغ کا زمانہ آرہا ہے، اس کی تحسین و تجمیل آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے اور اس شراب کے رسا ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ علوم و فنون کے چشمے ہر طرف ابل رہے ہیں۔ کائنات کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے جا رہے ہیں، قدرت کے جملہ برکات ہمارے لئے عسیر الحصول ہوتے جاتے ہیں، عناصر عالم نے انسان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا ہے "استخلاف فی الارض" کا وہ وعدۂ ربانی جو یوم الست میں کیا گیا تھا بہت جلد پورا ہونے والا ہے۔ اور دنیا ایک زمانۂ دراز تک انتظار کے جہنم میں پھنکنے کے بعد قرب و وصال کی فردوس سے ہم آغوش ہونے والی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سعادت و برکت ان کے لئے مقسوم نہیں ہے جنھوں نے دنیا کو "سجن المومن" سمجھ کر اسکو ٹھکرا دیا بلکہ ان خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس قید خانہ کو اپنے لئے رشک فردوس بنا لیا خواہ اس کا نام آپ "جنت الکافر" ہی کیوں نہ قرار دیں۔

انسان اسی دنیا کا ایک جزو ہے اور اسی کو آباد کرنے کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ قدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز، بیکس و مفلس، نادار و ناچار، محتاج و بیمار بن کر زندگی بسر کرے۔ دنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو

اس نے پھولنے اور پھلنے کے لئے نصب کیا تھا نہ کہ ویران و برباد ہونے کے لئے۔ پھر جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ موسم بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں، دورِ خزاں ختم ہو چلا ہے۔ تازہ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، گلہائے رنگا رنگ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہے ہیں اور بہت جلد خود ذات ربانی اُس کسوت نشاط و جمال میں رونما ہونے والی ہے جسے دست انسانی نے اپنے خالق کے لئے طیار کیا ہے۔ خدا غنی ہے اور وہ اس کا مہمان نہیں ہو سکتا جو محتاج و مفلس ہے۔ خدا غالب و قدیر ہے اس لئے وہ مغلوب و مفتوح کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ خدا پاکیزہ و طاہر ہے اس لئے وہ کثیف و بدسلیقہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ خدا اجمل و اکمل ہے اس لئے وہ ناقص و بدصورت سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ اسے مکمل دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے نقص سے نفرت ہے۔ بدصورتی سے احتراز ہے، حزن و ملال سے استکراہ ہے۔ اور اس لئے وہ قومیں جو درماندہ و عاجز ہیں، مغموم و ملول ہیں، یقیناً وہی ہیں جن کی طرف سے اس نے اپنا منھ پھیر لیا ہے اور جو قومیں غالب و فاتح ہیں، مسرور و شاد کام ہیں بیشک وہی ہیں جن سے خدا خوش ہے اور جن کو وہ دوست رکھتا ہے۔

اس دنیا میں ایک متشائم (Pessimistic) قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوتِ عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کر کے گدایانہ زندگی بسر کر رہی ہے وہ یقیناً ہلاک ہو کر رہے گی اور اسے ہلاک ہو جانا چاہئے۔ دنیا فطرت کا وہ کارنامہ ہے جس میں اس کی انتہائی تمنائے نشاط صرف ہو رہی ہے اور اس لئے ایک حزین و مایوس ہستی کا اس میں گزر نہیں۔ باغ کے وہ تمام پودے جو بیمار ہو کر مضمحل ہونے لگتے ہیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے صحیح و توانا درخت متاثر نہ ہوں بالکل اسی طرح وہ جماعتیں بھی فنا ہو جائیں گی، جن کے قوا مضمحل، جن کے دماغ ضعیف اور جن کی ذہنیتیں بیمار ہیں تاکہ خدا کی یہ کھیتی لہلہا اُٹھے اور اس کی زمین تمام خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔

جدید شاعری نمبر
سالنامہ سنہ ۱۹۶۵ء

جس میں جدید شاعری کے آغاز، ارتقاء، اسلوب، فن اور موضوعات کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس انداز سے کہ یہ بحث آپ کو حالی و اقبال سے لے کر دورِ حاضر تک کی شعری تخلیقات و تحریکات کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔

اس کے چند عنوانات

جدید شاعری کے اولین محرکات۔ جدید شاعری کی ارتقائی منزلیں۔ جدید شاعری کی داخلی و خارجی خصوصیات، جدید شاعری اور اس کے اصناف۔ جدید شاعری میں ابہام و اشاریت کا مسئلہ۔ جدید شاعری میں کلاسیکل عناصر۔ جدید شاعری کی تحریکات۔ جدید شاعری کی مقبولیت و عدم مقبولیت کے اسباب۔ نظم آزاد۔ نظم معریٰ۔ سانٹ اور جدید غزل کی خصوصیات۔ جدید شاعری کے نمایاں موضوعات و رجحانات۔ جدید شاعری کا سرمایہ اور اس کی ادبی قدر و قیمت وغیرہ۔

قیمت چار روپے

نگار پاکستان - ۳۲ - گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

میر لکھنؤ میں

محمد انصار اللہ نظر

محمد تقی میر کی شخصیت اور ان کی شاعری کا رعب ذہنوں پر کچھ اس طرح مسلط ہے کہ ان سے متعلق واقعات کی تحقیق میں بسا اوقات خاصی دشواری پیش آتی ہے لکھنؤ پہنچنے کے بعد ان کی شاعری میں تیزی اور تڑپ پہلے سے زیادہ ہو گئی لیکن اس کے واقعی اسباب کی طرف کم تر توجہ کی گئی اس مقالہ کا مقصد ان اسباب کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

عہد شاہ عالم میں دہلی اور اہل دہلی پر جو بپیری دقت پڑ رہا تھا اس کی تفصیل بیان کرنے کی احتیاج نہیں جتنے صاحب استطاعت شخص تھے بیشتر ترک وطن کر کے مختلف مقامات پر جا بسے۔ مگر کتنے ہی ایسے بے سر و سامان بھی تھے جنھوں نے مجبوراً صبر کا دامن تھاما وطن میں پڑے مصائب جھیلتے رہے ان ہی میں ایک محمد تقی میر بھی تھے۔ خود کہتے ہیں:۔

> ان ایام میں فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سر و سامانی سے مجبور تھا ـــــ
>
> (ذکر میر بحوالہ لکھنؤ کا دبستان ص ۱۲۵)

یہ کہنا صحیح نہیں کہ دہلی میں شعر و سخن کی قدر نہیں تھی شاہ عالم اور ان کے ولی عہد ابو النصر معین الدین (جو بادشاہ ہو کر اکبر شاہ ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے) نہ صرف شعرا کے قدر داں تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے، شاعروں کی ناز برداری جس طرح ان بادشاہوں نے کی ہے اس کی مثال کمتر ملے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف "داد و تحسین" سے پیٹ نہیں بھرا کرتے دہلی کا خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا شعرا ہی نہیں عام رعایا بھی معاشی بدحالی کا شکار تھی سودا نے اپنے ہجویہ قصیدہ تضحیک روزگار میں اس کا اچھا نقشہ پیش کیا ہے، ترک وطن کا بڑا سبب یہی تھا اس کے برخلاف فیض آباد اور لکھنؤ میں دولت کی فراوانی تھی میر کے سفر لکھنؤ کا باعث بھی مسئلہ معاش تھا مولانا محمد حسین آزاد کے الفاظ قابل لحاظ ہیں:۔

> وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا اس لئے سن ۱۱۹۰ھ میں (میر کو) دلی چھوڑنی پڑی لکھنؤ پہنچ کر ایک سرا میں اترے۔
>
> (آب حیات ص ۲۵۲)

سعادت خاں برہان الملک نے سلطنت اودھ کی بنیاد رکھی ان کی حیثیت اگرچہ صوبہ دار کی تھی لیکن انھوں نے فیض آباد کی آرائش اس طرح کی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد شاہجہاں آباد کی ہمسری کرے گا۔ اودھ کی صوبہ داری اگرچہ موروثی نہ تھی لیکن دہلی کی حکومت کی کمزوری نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ عملاً یہ موروثی ہی ہو کر رہ گئی تھی دہلی سے رقابت کا جذبہ روز افزوں تھا۔

دہلوی شعرا مثلاً خان آرزو، مرزا سودا، حسرت، جرأت، انشاء، مصحفی وغیرہ یکے بعد دیگرے لکھنؤ منتقل ہوتے گئے اودھ کے حکام نے بھی اس طرف خاص طور پر توجہ کی کہ دہلی کا مشاہیر شعرا ان کے دربار سے وابستہ ہو جائیں تاکہ ان کے

دربار کی زینت ہو چنانچہ انھوں نے خود ان شعرا کو دعوت دی مثلاً

بر مت بربادی دہلی قدیم کے آرزو لکھنؤ کو حسب صلاح نواب سالار جنگ کے چلا گیا اسی شہر میں درمیان ۱۱۶۹ھ گیارہ سو انسٹھ ہجری کے رحلت پائی لیکن نواب سالار جنگ نے موافق اس کی وصیت کے جنازہ اس کا دلی کو روانہ کر دیا تھا چنانچہ وہ دہلی میں مدفون ہوا۔　　(طبقات شعراء ہند ص۲۴۷)

اسی طرح سودا اور میر وغیرہ بھی امراء لکھنؤ کی دعوت پر ہی وہاں پہنچے ان مشاہیر کی ہجرت کے ساتھ ساتھ دہلی کے دربار کی رونق کمتر ہوتی جاتی تھی اور لکھنؤ کا دربار سمجھا جاتا تھا۔ شعرائے دہلی کو لکھنؤ بلانا بھی اسی جذبۂ رقابت کے سبب معلوم ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ ہی میں شاہ عالم بادشاہ کے بیٹے شاہزادہ سلیمان شکوہ کا دربار بھی سجتا تھا اور متعدد شعراء ان کے وابستگان دولت میں بھی تھے لیکن نواب وزیر چونکہ عملاً اودھ کے "فرمانروا" تھے اس لئے شعراء کی توجہ نواب وزیر کی طرف بہرحال زیادہ تھی۔ معاشی اعتبار سے بدحال دہلوی شعراء نواب کی خوشنودی کے لئے دہلی کی ہجو بھی کرتے تھے چنانچہ۔

آفتاب شاہ عالم...... اس کو شعر گوئی کا کمال شوق تھا مرزا رفیع السودا نے اس کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔　　(طبقات ص۱۴۴)

خود میر بھی جب لکھنؤ پہنچے تو انھیں نواب کی مصاحبت میں رہ کر کئی "صیدنامے" لکھنے پڑے۔ لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔

دہلی اور لکھنؤ کے مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حالات میں نمایاں فرق تھا دونوں مقامات کی پسند و ناپسند میں بھی اختلاف ہونا فطری تھا، لکھنؤ میں شاعری کا بھی ایک انداز رفتہ رفتہ پیدا ہونے لگا تھا لکھنوی شعرا اپنے محاورات اور روزمرہ کو بھی نظم کرنے لگے تھے چنانچہ مرزا علی نقی محشر (متوفی ۱۲۰۸ھ) نے یہاں تک کہا۔

گفتگو اردو زباں کی ہم سے کوئی جائے سیکھ　　کیا ہوا دہلی میں محشر اپنی پیدائش نہیں

اسی عہد میں ایسے شعرا بھی نظر آنے لگے جو اساتذۂ دہلی مثلاً سودا اور میر کے شاعر ہونے کے بھی منکر تھے مثلاً

حاکی تخلص میر محب علی است دی در سلک ملازمان مرزا محمد تقی خاں کہ یکی از امیر زادہ ہائے مرشد آباد بود انسلاک داشت گویند کہ سودای خام شاعری در دماغ خود چنداں می پخت کہ سرآمد شعراء فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنج بی نظیر محمد تقی میر را موزوں الطبع می گفت و شاعر نمی دانست۔

(مجموعہ نغز ط۱۹۲)

دہلوی تذکرہ نویسوں نے ان شعراء کی سخت مذمت کی ہے لیکن ان شعراء کا وجود اس دور کے مذاق شاعری کی غمازی ضرور کرتا ہے اسی دور میں شیخ قلندر بخش جرأت اپنے تمام معاصرین سے زیادہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر لکھنؤ کے مذاق شاعری اور وہاں کے ماحول کو سمجھا اور اسی کے مطابق اپنا طرز اختیار کیا دہلوی تذکرہ نویس حکیم قدرت اللہ قاسم کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ:۔

بنا بر توغل و مناسبت طبع رفتہ رفتہ گوئی سبقت از شعرای دیار مشرق ربودہ و بہ سبب میر مشقی حسب رواج آں دیار آنچناں اشعار ابداز طبع گوہر بارش تراوش میکند کہ مقدور فصحای انجا نیست و جمی

عنیراز سکنہ لکھنؤ نسبت تلمذ بروی داد ند گو دہی کثیر دی راد ایں فن شریف بی مثل و عدیل پنداد ند۔

(مجموعہ نغز صد ۱/۱۵۵)

جرأت کو لکھنؤ میں جو قبول عام حاصل ہوا اس کا اعتراف اکثر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے لکھنوی تذکرہ نویس احمد علی یکتا کا بیان ملاحظہ کیجئے:۔

درہر مجلس و مجمع کہ رونق افزا می شد بہ سبب خوش تقریری او کسی باد سخن نمی یافت و ہر گز بر خاطر بار نمی شد مادام (کذا) کہ زندہ بود مقبول دلہا و عزیز امرا بودہ صاحب عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر دام ظلہ اورا بسیار عزیز می داشتند شاگردان بی شمار بہم رسانیدہ و در ہر مشاعرہ کہ می آمد نصف مشاعرہ بلکہ زیادہ از تلامذہ او می شد۔ (دستور الفصاحت صہ ۹۹)

دہلی کے مہاجر شعراء کے سامنے معاش کا مسئلہ بہت اہم تھا، سعدی کا یہ مطلع نہایت مشہور ہے کہ:۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق　　کہ یاراں فراموش کردند عشق

کچھ ایسے ہی حالات ان شعرا کے سامنے بھی تھے، شاعری ان کا ذریعہ معاش تھی، ان کو ہر باصلاحیت شاعر سے اندیشہ محسوس ہوتا تھا چنانچہ آپس میں رقابت کا جذبہ بھی بہت پیدا ہو گیا تھا لکھنؤ میں شعرا کی معرکہ آرائیاں گویا روایت بن گئی تھیں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی حسرت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شاعری کے علاوہ ان کی دولت بھی معاصرین کی نظروں میں کھٹکتی تھی، چنانچہ بہ کثرت نظمیں ان کی ہجو میں لکھی گئیں جن میں سودا نے بھی حصہ لیا خود حسرت نے بھی ایک لکھنوی حکیم کی ہجو لکھی ان امور پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انشاء اور مصحفی کے معرکے لکھنؤ کی شاعرانہ زندگی میں کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ (لکھنؤ کا دبستان شاعری صہ ۱۳۳)

جعفر علی حسرت، میاں جرأت کے استاد تھے، اس وقت میں یہ عرض کرنے سے قاصر ہوں کہ جرأت نے ان مواقع پر حق شاگردی کس طرح ادا کیا، بہرحال یہ حقیقت مسلم ہے کہ لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول پر جرأت کچھ اس طرح مسلط تھے کہ ہر نوارد شاعر کو پہلے ان سے نپٹنا پڑتا تھا چنانچہ مصحفی کے حالات میں ہے کہ:۔

در ایامیکہ وارد لکھنؤ گردید آں وقت وعدہ در میاں جرأت بود و مردم شہر ہمہ مسخر طرز دل پسند او۔ مشارُ الیہ چوں دید کہ کسی ملتفت بحالش نمی شود با جرأت طرح خلاف انداختہ۔

(دستور الفصاحت صہ ۹۴)

مصحفی اور انشاء کے معرکے بہ وجوہ بہت مشہور ہیں لیکن مصحفی اور جرأت کے مباحثے بھی قابل ذکر تھے چنانچہ اکثر تذکروں میں اس کا ذکر ہے۔

مصحفی با جرأت و انشاء مشاعرات و مطارحات کردہ است۔ (گلشن بے خار صہ ۲۲۱)

مصحفی، جرأت اور انشاء سے مباحثہ بہت کرتا تھا۔ (طبقات صہ ۳۵۰)

غرض ان حالات میں محمد تقی میر لکھنؤ پہنچے میر کی بے سرو سامانی کا جو نقشہ مولانا محمد حسین آزاد نے پیش کیا ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے بے اصل قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ آزاد نے ان کی روانگی کا سال ۱۱۹۰ھ بتایا ہے۔

یہ یقیناً غلط ہے مرزا علی لطف کا بیان ہے۔

۱۱۹۷ھ میں دوایات عزم اس صاحب لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ (گلشن ہند ص۱۱)

یہ خیال کہ میرؔ صاحب از خود لکھنؤ گئے غلط معلوم ہوتا ہے، بے سروسامانی ان کے عزم سفر میں حائل تھی البتہ سوداؔ کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب زادِ سفر بھیجا تو میرؔ صاحب لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے خود کہتے ہیں۔

میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحٰق خاں مؤتمن الدولہ نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں میں تو پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا اول سالار جنگ کے ہاں گیا۔

(ذکر میرؔ بحوالہ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۱۴۵)

میر صاحب کو نواب وزیر نے مدعو کیا تھا اس کی شہادت احمد علی یکتاؔ کے یہاں بھی ملتی ہے۔

نواب آصف الدولہ مغفور مرحوم ہم بعد رحلت مرزا، میرؔ را از شاہجہاں آباد فخریہ طلب داشتہ بہ منصب عالی ملازم ساخت و از خاطر داری و پاس مشارٌالیہ ہیچ دقیقہ فرد نمی گذاشت (دستور الفصاحت ص۲۵)

سوداؔ کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا، میرؔ کی طلبی اس کے بعد ہی ممکن تھی چنانچہ ۱۱۹۷ھ میں آئے۔ میرؔ کے سفر کے متعلق نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی البتہ شاہجہاں آباد سے "ناکام" جانے کا ذکر کیا ہے:۔

در بدو حال بہ شاہجہاں آباد و آمدہ تمتع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ میگذرانید و مایحتاج از سرکار نواب وزیر ممالک بہادری یافت بعد ازانجا بسیر ملک عدم شتافت۔ (گلشن بے خار ص۲۹)

منشی کریم الدین نے اکثر حالات گلشن بے خار سے ترجمہ کئے ہیں چنانچہ میرؔ کے سلسلہ میں بھی شیفتہؔ کے ان ہی جملوں کا ترجمہ کر دیا ہے۔

ابتداء حال میں درمیان شاہجہاں آباد کے آیا ناکام پھر کر لکھنؤ کو چلا گیا سرکار نواب وزیر الممالک میں ملازم ہوا ۱۷۹۳ء میں اس جائے فوت ہوا۔ (طبقات ص۱۱۹)

وزیر الممالک نے میرؔ کو طلب کیا اور رعایت سے پیش آئے اس کا ذکر ایک معاصر تذکرہ نویس کے الفاظ میں اور ملاحظہ کیجئے۔

از چند سال در بلدہ لکھنؤ بہ طلب وزیر الممالک آصف الدولہ رفتہ است و نواب موصوف با او بہ رعایت پیش آمدہ تا حال کوس سخنوری در لکھنؤ می نوازد۔ (تکملۃ الشعرا بحوالہ دستور الفصاحت ص۲۲)

دراصل مرزا محمد رفیع سوداؔ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کے مقرب خاص تھے ان کے انتقال سے لکھنؤ ایک عظیم شاعر سے خالی ہو گیا اس کمی کو میرؔ سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن میرؔ کی طبیعت بہت مختلف تھی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے میرؔ کے لکھنؤ پہنچنے سے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے۔

(میر صاحب کو) معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے وہ نہ رہ سکے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے جب داخل محفل ہوئے تو انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور

کا وطن کہاں ہے۔ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے تاراج کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا، بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی (آب حیات ص۲۵۲)

اس واقعہ میں کئی باتیں خلاف قیاس ہیں۔

۱ ـــ میر صاحب نواب وزیر کی طلبی پر آئے تھے ان کا آنا کچھ اچانک نہ تھا، لکھنؤ میں اس کا چرچا عام رہا ہوگا۔

۲ ـــ لکھنؤ والوں کی پوشش اور وضع اگر بدل بھی گئی ہو تو بھی دہلی سے مختلف لوگ برابر آتے رہتے تھے میر صاحب کی دہلوی وضع اتنی عجیب نہیں ہو سکتی کہ اہل محفل اسے دیکھ کر ہنس دیتے اور یہ پوچھتے کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟

۳ ـــ مشاعرے میں بیشتر لوگ میر صاحب سے واقف تھے، لکھنؤ کے اس دور کے اساتذہ میں جرأت، مصحفی، سوز، حسرت، انشاء وغیرہ سب میر صاحب کو اچھی طرح پہچانتے تھے ایسی صورت میں انھیں اپنا تعارف کرانے کی ضرورت کا پیش آنا کسی طرح قابل قبول نہیں، تجاہل عارفانہ کی گنجائش بھی نہیں تھی کیونکہ یہ بات ڈھکی چھپی نہ رہی ہوگی کہ میر صاحب نواب وزیر کی طلبی پر آ رہے ہیں۔ ان حالات میں آزاد کا وہ لطیفہ بھی کہ میر جب لکھنؤ کے لئے ان کی جیب میں کرایہ کے پورے پیسے بھی نہ تھے خیالی ہی سمجھا جانا چاہیئے۔ اسی طرح ان کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ "دفتہ دفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا کہ میر لکھنؤ آ گئے" (آب حیات ص۲۵۲) میرا خیال ہے کہ مذکورہ قطعہ میر نے کسی اور موقع پر اہل لکھنؤ کی ناقدریوں سے عاجز آ کر کہا ہوگا۔ ان ناقدریوں کی کیفیت آگے آئے گی۔ لکھنؤ پہنچنے کے بعد میر کو نواب وزیر کے یہاں حصول ملازمت میں تقریباً ایک ہفتہ لگا اور نواب آصف الدولہ مرحوم نے بعد ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔

(گلشن ہند ص۲۱۰)

میر باصلاحیت اور کہنہ مشق استاد تھے، صاحب طرز تھے اور کافی شہرت بھی انھیں حاصل تھی لکھنؤ پہنچنے کے بعد وہاں کے شعرا کو ان کی شاعری سے "اندیشہ" کا لاحق ہونا قدرتی امر تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مخالفت پر اکثر کمربستہ ہو گئے میر محب علی حاتی اور ان کے ہمنواؤں نے میر کی شاعرانہ صلاحیتوں سے کھل کر انکار کیا، دہلی میں بھی سودا وغیرہ شعرا سے چشمک تھی لیکن کسی نے ان کے شاعر ہونے پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔ اس انکار کی خبر سے میر کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ میر صاحب دہلی کے محاورات پر فخر کرتے تھے اور اپنے اشعار کو سمجھنے کے لئے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی بولی کا جاننا ضروری سمجھتے تھے، لکھنؤ میں محشر نے صاف کہہ دیا کہ "اردو زبان" کوئی ہم سے سیکھ جائے، میر کے ذہن کو پریشان کر دینے کے لئے یہ ماحول کافی تھا۔

میر کے خلاف ماحول دربار کے باہر اور دربار کے اندر ہر جگہ معلوم ہوتا ہے، ایک واقعہ سنئے:-

"نقل است کہ روزی میر صاحب قصیدہ تازہ گفتہ بدربار آوردند نواب وزیر کہ از چاشت فراغت کردہ متوجہ شنیدن شد میر صاحب شروع بخواندن کردند طول دادند اتفاقاً

ان روز ملا محمد مغلی ذاکر تازہ از ولایت آمدہ و شاعر ہم بودہ بپائی ملازمت آوردہ می خواست کہ آنہم چیزی در مدح حضور بخواند و تطویل قصیدہ میر وقت نہ گذاشت ملا محمد تنگ آمدہ گفت کہ میر صاحب قصیدہ خوب است اما طولانی اگر دماغ نواب صاحب وفائی کرد کہ می شنید؟ میر بجرد استماع بیاض از دست انداختہ و منغض شدہ گفت کہ اگر دماغ نواب وفائی کرد دماغ من کجا وفا می نماید؟ مطلق پاس حضور نہ نمودہ نواب کہ خود خلق مجسم بودہ استمالہ مزاج میر بکمال مہربانی و ملتہا نمودہ بقیہ قصیدہ ہم تمام شنیدہ و خاطر ملا ہیچ نہ کرد۔ (دستور الفصاحت ص۲۵)

اغلب ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میر تازہ وارد لکھنؤ تھے نواب وزیر ان کی ہر طرح عزت و پاسداری کرتے تھے لیکن ریشہ دوانیاں شروع ہو چکی تھیں، نواب کے استاد میر محمدی سوز خود بھی محمد تقی میر سے کچھ خوش نہ تھے انھیں میر ہی کی وجہ سے اپنا تخلص بدلنا پڑا تھا خود نواب وزیر کا معاملہ بھی یہ تھا کہ وہ سودا، انشاء اور جرأت کا کلام پسند کرتے تھے، انشاء کے یہاں پھر بھی ظرافت تھی لیکن سودا کے انتقال کے بعد جرأت اس عہد کا سب سے زیادہ مقبول شاعر تھا اور جرأت کی معاملہ بندی کو میر صاحب "چوما چاٹی" سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اس سلسلہ کا ایک لطیفہ معاصر تذکرہ نویس حکیم قدرت اللہ قاسم نے نقل کیا ہے اس کا اردو ترجمہ منشی کریم الدین نے کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:-

ایک روز کا ذکر ہے کہ مجلس شعرا مرزا محمد تقی خاں ترقی تخلص کے گھر میں منعقد ہوئی یہ شاعر (جرأت) بھی بہت سے اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر شریک محفل ہوا غزلیں پڑھیں اور نہایت مورد تحسین و آفریں خاص و عام کا ایسا ہوا کہ شعر کا سننا مشکل ہو گیا سمجھنا تو کجا اتفاقاً سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر بھی اس مجلس میں حاضر تھے قلندر بخش جرأت نے جرأت کر کے اپنے تئیں میر کے پہلو تک پہنچایا اور داد خواہ اپنے اشعار کا ہوا میر نے دو چار بار خاطر داری کی جب کہ دیکھا کہ مفر اس کا چل نکلا کہا کہ جب کہ تم بدین جد و کد پوچھتے ہو لاچار کہتا ہوں (میر کا مقولہ بعینہ لفظ نقل کرتا ہوں وے یہ ہیں) کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔ (طبقات ص۲۰۶)

جرأت کے قبول عام کا اور میر کے طرز سے ان کے انداز شاعری کو جتنا بُعد تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے، اس ماحول میں میر کے کلام کی قدر ہوتی بھی تو کیسے' ان کے یہاں نہ معاملہ بندی تھی نہ ایسے عشقیہ مضامین اور نہ یہ ظرافت۔ میر کی طبیعت ایسے مضامین کے لئے مناسب بھی نہ تھی ہو سکتا تھا کہ وہ دربار کا کچھ خیال کرتے اور اپنی طبیعت پر کچھ جبر کر کے اس مخصوص ماحول کے مطابق شعر کہنے کی کوشش کرتے لیکن مخالفتوں نے انھیں اور تلخ کام بنا دیا تھا، ان کے لہجے میں تیزی، خیالات میں یاسیت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ لکھنؤ کے عام مزاق سے دور ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ نواب آصف الدولہ کی طبیعت بھی ان کی شاعری سے ہٹ گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے حوالے سے ایک

لہ سلسلۃ الذہب مصنفہ حضرت جامی قلمی نوشتہ ۱۲۱۲ھ (مملوکہ قاضی عیاض علی صاحب رئیس بیواں) کے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:-

تمت تمت الکتاب بعون ملک الوہاب حسب الفرمائش عالی منزلت ستودہ خصلت مشیخت پناہ افضلیت دستگاہ ملا محمد نظر مرغلانی (کذا) بہ ید حقیر الحقیر اضعف العباد محمد منور عرف زیرک (کذا) کشمیری ۔۔۔۔۔۔

اگر یہ ملا محمد وہی ہے جس کا ذکر میر کے سلسلہ میں آیا ہے تو اس کی شخصیت اور نواب وزیر کی میر کی قدر افزائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حکایت بیان کرتا ہوں۔

ایک دن نواب نے بلا بھیجا جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں ہاتھ میں چھڑی ہے پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمائیے میر صاحب، نے غزل سنانی شروع کی نواب صاحب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے نواب صاحب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیے آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ مچھلیوں سے کھیلتے ہیں متوجہ ہوں تو پڑھوں نواب صاحب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرے گا میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گذری غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ (آب حیات ص ۲۵۳)

یہ واقعہ محض حکایت نہیں بلکہ اس سے پتا چلتا ہے کہ میر صاحب کا انداز شاعری اب بالکل نامقبول تھا اس کی جگہ ایک مختلف مذاق شاعری عام ہو چکا تھا آصف الدولہ کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میر نے جو چار شعر سنائے وہ ان کے نزدیک بھی "شعر" نہ تھے اس دور میں اہل لکھنؤ سادگی بیان کی جگہ تشبیہات واستعارات اور تراکیب کا استعمال پسند کرتے تھے، عام خیال اور سیدھے سادے جذبات کی جگہ وہ خیال بندی اور معنی آفرینی کی طرف مایل ہوتے تھے، سنجیدگی کے مقابلے میں ظرافت پسند کی جانے لگی تھی عشق کا مزاج بھی بدل گیا تھا اب کسی "لونڈے" کے حسن کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ اب عورت کے حسن میں کشش محسوس کی جانے لگی تھی، میر اپنی پرانی وضع پر قائم تھے اہل لکھنؤ ان کے کلام سے دلچسپی نہیں لے سکتے تھے، مشاعروں میں جرأت کامیاب تھے۔ میر صاحب مجبوراً گوشہ نشین ہو چلے تھے۔

لکھنؤی شاعروں کو میر کی شخصیت سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ دہلی کے مہاجر شعراء کے لئے دہلی کی نسبت میں بڑی کشش تھی لیکن ماحول کے تقاضے کچھ اور تھے جرأت، مصحفی، انشاء، رنگین سب ہی میر صاحب کے مقابلے میں آئے برسر مشاعرہ اس قسم کے اشعار پڑھے گئے میر صاحب سنتے تھے، یہ دن بھی انھیں دیکھنے تھے، قسمت انھیں اسی لئے لکھنؤ لائی تھی۔

جرأت :۔ نیستان سخن میں کون اب جرأت کے مقابل ہو — یہ زور اسکے تئیں بخشا ہوا ہے شیر میزداں کا

جرأت جواب میر تو ایسا ہی کہہ کہ اب — چاروں طرف سے شور اٹھے واہ واہ کا

مصحفی :۔ ہو چکا دور میر اور مرزا — اب زمانے میں ہے مرا دورا

جو چاہے کرے مجھ سے فن شعر میں پنجہ — سودا نہیں بیٹھے تو ہیں سودا کی جگہ میر

میر کی پریشانی کا تصور کیجئے، لکھنؤ سے دل برداشتہ ہو گئے، حالت یہ ہوئی کہ کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ رہ گیا، مرزا علی لطف جو میر کے بڑے مداح ہیں کس قدر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں۔

ناقدردانی سے اختیار کی اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معنی پرداز ہے۔ مقال کا وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس

کی پوچھتا آج ہے۔ (گلشن ہند ص ۲۰۹)

نانِ شبینہ سے محتاجی کی صرف یہ صورت ممکن ہے کہ میر کی غیرت دار طبیعت نے نواب وزیر کے یہاں سے تنخواہ لینی پسند نہ کی ہو ورنہ ان کی تنخواہ کم از کم ۱۲۱۵ھ (تالیف گلشن ہند) تک بند نہیں ہوئی تھی۔ میر لکھنؤ میں آکر بُری طرح پچھتا رہے تھے یہاں سے کہیں بھی چلے جانا چاہتے تھے، کلکتہ کے لئے درخواست دی اس کا حشر بھی علی لطف کے لفظوں میں سنئے۔

> جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ کو گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ کے دو بعد تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بے چارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانان نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جاتے درخواست حمالی ہے۔
>
> (گلشن ہند ص ۲۰۹)

میر کو اب پچھلے زمانے یاد آنے لگے، دہلی کی صحبتیں یاد کرتے اور تڑپ تڑپ کر کہتے

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا — وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

جب وہ اپنے لکھنؤ چلے آنے کا خیال کرتے تو انھیں انتہائی ملال ہوتا کبھی لکھنؤ کو بُرا بھلا کہتے اور کبھی اپنی سرگشتگی کا رونا روتے لیکن مجبور تھے اسی ماحول میں زندگی کے باقی دن بھی کاٹنے ہی تھے۔

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا — مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

لکھنؤ دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس — میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

میر صاحب دلی واپس جانے کی بھی سوچتے لیکن نہ بدن میں قوت تھی اور نہ سامان سفر مہیا تھا کس قدر حسرت سے کہتے ہیں۔

متاعِ ہنر پھیر لے کر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

مگر میر صاحب کی یہ آخری تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی انھیں پھر دلی جانا نصیب نہ ہوا موت نے ان کی مشکلیں آسان کیں ۱۲۲۵ھ میں راہیٔ ملک بقا ہوتے۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ
علی شیر خاں
محلہ کھترانہ کلاں - رائے بریلی یو-پی

خلیل مطران

جدید عربی ادب میں دبستان شعر کا ایک امام

ظہور احمد اظہر (لکچرر جدید عربی ادب ۔ اورنٹیل کالج لاہور)

خلیل مُطران ۱۸۷۲ء میں لبنان کے مشہور تاریخی شہر بَعلَبَکْ کے ایک کیتھولک عیسائی عرب گھرانے میں پیدا ہوا ۔ اس کے والد کا نام عبدہ مطران تھا اور شہر کے معزز گھرانے اُسرۂ مطرانیہ یا مطرانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو تجارتی کاروبار کے علاوہ باغات اور زمین کا مالک بھی تھا ۔ اس کی والدہ ملکہ صباغ آل صباغ کے مشہور معزز گھرانے سے تھی ۔ ملکہ صباغ کی ماں چونکہ ایک اچھی شاعرہ تھی اس لئے بیٹی بھی تعلیم یافتہ ، باذوق اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتی تھی ۔ خلیل کا والد تجارت پیشہ ہونے کے باوجود بھی ادب و ثقافت سے لگاؤ رکھتا تھا مگر بایں ہمہ والدین اپنے بیٹے کو شاعر یا ادیب دیکھنے کے بجائے دولت و عزت کا مالک دیکھنے کے متمنی تھے ۔ شعری ذوق خلیل کو ماں سے ورثے میں ملا تھا اس لئے وہ بچپن سے ہی نغمہ و ساز کی دیوی کی پرستش کرنے لگا تھا ۔ والد اپنے بیٹے کو اکثر نصیحت کیا کرتا تھا کہ بیٹے ! شاعر مت بننا کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں کسی شاعر کے جسم پر کبھی قمیص نہیں دیکھی مگر خلیل کے لئے تو یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ شعر کی دیوی کا سچا اور مخلص پرستار بن کر آسمان شہرت پر چمکے اور عربی ادب کی تاریخ میں بقائے دوام حاصل کرے ۔ چنانچہ آٹھ سال کی عمر تک اسے متعدد اشعار اور قصائد زبانی یاد ہو چکے تھے ۔

والد نے اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور اسے زحلہ کے اورنٹیل اسکول میں داخل کرا دیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس مشہور تعلیمی ادارے کے ایک ڈیسک پر اب تک خلیل کا نام منقوش ہے ۔ اس کے بعد خلیل کو بیروت کے رومن کیتھولک مشنری اسکول (مدرسہ البطریرکیہ) میں داخل کرایا گیا جہاں اس نے زمانے کے مشہور ادیب ابراہیم الیازجی سے عربی زبان سیکھی ۔ ابراہیم نے خلیل کے ادبی ذوق کو خوب جلا بخشی اور شعر و شاعری کی صلاحیت اور رغبت دیکھ کر خصوصی توجہ سے رہنمائی کی ۔ استاد کی وفات پر وفادار اور نامور شاگرد نے اپنے مربی اور استاذ کا مرثیہ کہا جس میں یہ شعر بھی تھا ۔

رَبَّ البَیانِ وَسَیِّدَ القَلَمِ ‏ ‏ ‏ ‏ وَفِیتَ قِسْطَکَ لِلعُلَا فَنَمْ

اے قلم و بیان کے دیوتا ! تو نے عظمتوں میں سے اپنا پورا پورا حصہ پا لیا اب آرام سے محو خواب ہو جا !

اسی مدرسہ میں خلیل کو فرانسیسی زبان کا ایک ماہر استاد میسر آگیا جس سے اس نے فرانسیسی ادب اور زبان کی تعلیم حاصل کی اور زبان پر عبور حاصل کرنے کے علاوہ فرانسیسی شعر و ادب سے بھی واقفیت حاصل کی۔ یہیں اس نے فرانس کا مشہور قومی گیت "مارسیلیز" سیکھا اور یاد کیا۔ اس گیت نے شاعر کے رجحانات اور زندگی پر گہرے اور دور رس اثرات ڈالے۔

زمانہ طالب علمی ہی سے خلیل نے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی تھی اور بیروت کے ادبی حلقے اس سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اس نے سلطان عبدالحمید خاں کی متشددانہ پالیسی کے خلاف باغیانہ اشعار کہنا شروع کر دئے، وہ بیروت کے نوجوانوں کو ساتھ لے کر سمندر کے کنارے چلا جاتا اور کبھی اپنے کلام سے اور کبھی فرانس کا ترانۂ حریت سنا کر ان کے خون کو گرماتا۔ رفتہ رفتہ یہ بات حکومت تک پہنچ گئی اور خلیل کو بغاوت پر اکسانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن کوئی واضح ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے رہا کرنا پڑا۔ البتہ مختلف وسائل سے اسے ہراساں کرنے کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ ایک رات حکومت کے جاسوسوں نے اس کے بستر پر گولی چلا دی مگر خوش قسمتی سے وہ اس وقت بستر میں نہیں تھا اس لئے اسے کوئی گزند نہ پہنچی مگر والدین اپنے جوان بیٹے کی زندگی اور مستقبل کے متعلق بہت پریشان ہوئے اور اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے پیرس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ پیرس پہنچکر خلیل کو فرانسیسی ادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا اور مغربی ادب کے مختلف سرچشموں سے سیراب ہو کر اس نے اپنے شعری ذوق کو نئی روح عطا کی۔ یہاں اس نے طبعی شاعری (نیچرل شاعری) رمزیت، رومانویت اور دیگر مکاتب فکر کا قریب سے مطالعہ کیا اور ان سے متاثر ہوا۔

خلیل جس زمانے میں پیرس میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس زمانے میں ترک نوجوانوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ انھوں نے ایک خفیہ جماعت بنا رکھی تھی جو سلطان عبدالحمید کے ظلم و استبداد کے خلاف اور جمہوریت کی ترویج کے لئے کوششوں میں مصروف تھی۔ خلیل بھی اس میں شامل ہو گیا۔ عثمانی سفارت خانے کو جب خلیل کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو فرانسیسی حکومت سے اسے ملک بدر کرنے کی درخواست کی مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

خلیل کے لئے تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس آنے کی اب گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ اس لئے اسے اپنے مستقبل کے متعلق نئی راہیں متعین کرنیکی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں لبنان و شام کے عیسائی عربوں کی ایک بہت بڑی تعداد جنوبی امریکہ میں ہجرت کر گئی تھی۔ خلیل مطران نے بھی وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا اور اس غرض کے لئے ہسپانوی زبان بھی سیکھی اور امریکہ میں بعض دوستوں اور رشتہ داروں سے امداد کا یقین بھی حاصل کر لیا مگر اچانک اسے خیال آیا کہ عثمانی ترکوں کے باغیوں کی ایک اور بھی پناہ گاہ ہے اور وہ ہے مصر، چنانچہ اس نے مصر کو اپنا وطن ثانی بنانے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۹۳ء میں اسکندریہ پہنچ گیا اور پھر مرتے دم تک مصر کو نہ چھوڑا۔

مصر میں خلیل نے میدان صحافت میں قدم رکھ کر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور مسلسل سات سال اس پیشہ سے وابستہ رہا۔ اس عرصہ میں وہ روزنامہ الاھرام کا ایڈیٹر بھی رہا اور المجلۃ المصریۃ کے نام سے اپنا ایک ماہنامہ اور الجوائب المصریۃ کے نام سے ایک روزنامہ بھی جاری کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی مصر میں صحافت کو فروغ اور وقار حاصل نہیں ہوا تھا۔ مالی مجبوریوں کی وجہ سے صحافی ضمیر فروشی اور اپنی خودداری کو مجروح کرنے پر مجبور ہوتا تھا اس لئے خلیل مطران نے ۱۹۰۴ء میں صحافت کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

صحافت سے نکلنے کے بعد وہ مختلف مناصب پر فائز ہوتا رہا کبھی محکمہ زراعت میں مصر کی اقتصادی اور زرعی ترقی

کے لئے کوشاں رہا اور کبھی مصر میں ڈرامے اور تھیٹر کو ترقی دینے کے لئے مصر کی قومی تھیٹریکل کمپنی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس عہدے پر فائز رہ کر خلیل نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں سے کئی ڈراموں کے تراجم کئے جو شائع بھی ہوئے اور اسٹیج بھی کئے گئے۔ ان میں شیکسپیر کے ڈرامے مرچنٹ آف وینس، ہملیٹ، رچرڈ تھرڈ، کنگ لیر اور جولیو سیزر کے تراجم بھی شامل ہیں۔ مصری تھیٹر پہلے صرف اونچے طبقے کے لئے وقف تھا۔ خلیل آخری دم تک اسے عوام میں مقبول بنانے میں منہمک رہا۔

۲۹ مارچ ۱۹۴۷ء کو مصر کے اہل ذوق اور ادبا و شعرا نے اس عظیم شاعر کی ملی اور ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اس کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب منعقد کی جس میں عرب ممالک کے شعرا اور اہل قلم شریک ہوئے شاعر کی زندگی پر مقالات لکھے گئے اور قصائد پڑھے گئے جو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں مھرجان الخلیل (خلیل کی جوبلی) کے نام سے شائع کئے گئے۔ یہ تقریب گویا شاعر کے لئے الوداعی تقریب تھی کیونکہ اس کے بعد وہ بیمار ہو گیا اور روز بروز صحت گرتی گئی۔ اور آخر کار اگست ۱۹۴۹ء میں شعر و ادب کا یہ درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اور عربی ادب کا ایک سنہری باب انتہا کو پہنچ گیا۔

شاعر کے حالات زندگی کے اس مختصر خاکے کے بعد یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ چند لفظوں میں اس کے ماحول کا مختصر جائزہ بھی پیش کر دیا جائے کیونکہ ماحول کے پس منظر میں کسی عظیم شخصیت کو دیکھنا بہت آسان ہوتا ہے اور اس کے کارناموں کی قدر و قیمت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان کا یہ عظیم شاعر انیسویں صدی کے ربع آخر میں اور بیسویں صدی کے نصف اول میں عربی ادب کی سطح پر ظاہر ہوا اور اپنی خدا داد صلاحیت اور مسلسل کوشش سے شہرت عام اور بقائے دوام سے ہمکنار رہا۔ یہ زمانہ دنیائے عرب کے اضطراب و بے چینی، ذلّت و غلامی اور بیکسی و محرومی کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں مغربی استعمار نے دنیائے عرب کے حصے بخرے کئے۔ ترکان عثمانی سے دست و گریباں ہوئے۔ ترکوں اور عربوں کے درمیان بدگمانی کی فضا قائم کی اور نفرت کے بیج بوئے اور تہذیب کے نام پر مشرق کی سرزمین کا اقتصادی استحصال کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک یورپ دولت عثمانیہ کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے لئے اپنے استعماری ہتھکنڈوں کو بروئے کار لانے میں مصروف رہا۔ عربوں کو سفید باغ دکھا کر دولت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا اور جنگ کے خاتمے پر مغربی سامراج بے نقاب ہو گیا۔ دنیائے عرب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ عربوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں اور مغربی سامراج کی اسلام دشمنی اسرائیل کی شکل میں دنیا کے سامنے آگئی۔ عرب معاشرہ انتہائی غربت اور انتہائی دولتمندی کا شکار ہو کر توازن کھو بیٹھا، مغربی تہذیب نے عرب ثقافت پر گہرے اثرات ڈالے۔ اس محرومی کی فضا میں عربوں کو اپنا شاندار ماضی یاد آیا۔ آثار قدیمہ کے اکتشافات اور ناقابل فراموش علمی کارناموں کی یاد نے عربوں میں ایک نئے احساس کو جنم دیا اور اب وہ ایک ہی نعرہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ مکمل آزادی یا عزت کی موت۔

خلیل کی شاعری میں آپ کو یہ تمام لہریں اٹھتی ہوئی نظر آئیں گی۔ وہ عربوں کے شاندار ماضی کے گیت گاتا ہے اور انھیں عزت کی زندگی یا عزت کی موت پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ مغربی آداب سے متاثر ہو کر عربی ادب کو نیچرل شاعری، ڈرامائی اور غنائی شاعری، غزل گوئی اور دیگر جدید فنون سے بھی متعارف کراتا ہے۔

عربوں کی پستی اور حرماں نصیبی نے عرب قومیت کو جنم دیا۔ چنانچہ قوم پرستی اور حب الوطنی دورِ جدید کے عرب شعرا کے ہاں خاص اور مرغوب موضوع رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عرب ایک بہادر اور خوددار قوم ہیں۔ انانیت، خودپسندی اور عزتِ نفس ان کے خمیر میں داخل ہے۔ لیکن گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں عرب جس کیفیت اور صورتِ حالات سے دوچار رہے ہیں۔ اس نے ان کے اس فطری جذبے کو بڑی ٹھیس پہنچائی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ شعراء و ادباء ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ادباء نے قدیم عرب سورماؤں کے حالات کو افسانوی رنگ میں پیش کرکے اور ماضی کی شاندار داستانوں کو دہرا کر عرب قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی اسی طرح شعرا نے بھی عربوں کی عظمتِ رفتہ کے گیت گاگر اور موجودہ بدحالی اور بیکسی کا دردناک نقشہ پیش کرکے اپنی قوم کو جھنجھوڑا اور اس سامراج سے انتقام لینے کے لئے بھڑکایا جس کے ظلم و استبداد کی چکی میں وہ ایک مدت سے پستے چلے آرہے ہیں اور جس کی مکاری و عیاری ان کے حقوق کو مسلسل پامال کرتی آرہی ہے۔ اس طرح جدید عربی ادب میں ایک خاص ذخیرہ شعر و نثر جمع ہوگیا۔ جسے "قومی ادب" کہا جاتا ہے۔ اس ادب کی تخلیق میں عرب کے سیاسی زعما اور نقادوں کی کوششوں کا بڑا دخل ہے جنھوں نے شعرا و ادبا کو قومی ادب کی تخلیق کی پرزور دعوت دی، اس کا آغاز مصر کے مشہور قومی لیڈر محمد فرید نے علی الغایاتی کے دیوان "وطنیتی" کا مقدمہ لکھ کر کیا اور "ثورۃ الادب" (ادب کی بغاوت) کے مصنف محمد حسین ہیکل کے ہاتھوں یہ تحریک اپنے عروج کو پہنچی اور شاعر و ادیب قومی ادب کی تخلیق میں مشغول ہوگئے، خلیل مطران نے بھی قوم پرستی اور حب الوطنی میں ایک خاص مقام پیدا کیا۔

جدید عربی ادب میں قومی شاعری کے تین اہم پہلو ہیں۔ ایک تو قدیم داستانیں، روایات و آثار ہیں جنہیں عرب شعرا نے اپنا موضوع بنایا اور اپنی قوم کو شاندار ماضی کی زندہ جاوید روایات یاد دلاکر بیدار کیا اور ان میں احساسِ خودداری و خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا پہلو معاصر زعما، مجاہدین اور مفکرین کی مدح سرائی ہے۔ عرب شعرا نے اپنے دور کے ان عظیم انسانوں کی خدمات اور کارناموں کو سراہا۔ قوم کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دلائی اور ان سے بے پناہ محبت کرنے کی تلقین کی۔ عربوں کی قومی شاعری کا تیسرا پہلو دنیائے عرب کی موجودہ بدحالی اور مغربی سامراج کی مکاریاں اور مظالم ہیں۔ جس کی واضح مثال یہودی ریاست کا قیام ہے۔ یہ موضوع جتنا اہم، دردناک اور پرسوز ہے اتنا ہی اس کے متعلق کم کہا اور لکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ گذشتہ سال بغداد میں عرب ادبا کی کانفرنس میں اسی بات پر سخت تشویش ظاہر کی گئی کہ فلسطین کے سانحہ کے متعلق عرب شعرا اور ادبا نے بہت کم کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ اس المیہ کی حقیقی ترجمانی نہیں کرتا۔

خلیل مطران کی قومی شاعری میں یہ تینوں موضوعات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اس میدان میں وہ کئی لحاظ سے اپنے معاصر شعرا پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کی قومی شاعری میں حافظ ابراہیم کے سوزِ جگر اور احمد شوقی کی ولولہ انگیزی کے علاوہ فکر کی گہرائی اور کامیاب طنز کا عنصر بھی موجود ہے۔ جس طرح مصر کے یہ دونوں ممتاز شعرا — حافظ و شوقی۔ وطن پرستی اور عرب قومیت کے پرزور داعی ہیں اور فراعنہ مصر کی گذشتہ عظمتوں اور مصری قوم کے شاندار ماضی کے گیت گاتے ہیں اسی طرح خلیل مطران بھی حب وطن اور قوم پرستی کے جذبات سے سرشار ہے۔ بلکہ وہ تو ان سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور مصری قوم کی عظمتوں کے ساتھ ساتھ شام و لبنان کی قدیم ترین قوم فینیقیوں کی عظمتوں کی یاد کو بھی تازہ کردیتا ہے

مصر کے مشہور فرعون رمسیس ثانی (RAMSIS II) کے مجسمے پر شوقی اور خلیل دونوں نے قصائد لکھے ہیں اور ان دونوں قصیدوں کے بارے میں فیصلہ دینا مشکل ہے۔ کیونکہ شوقی کا یہ قصیدہ اگر سلاست و روانی اور شستہ و دلکش اسلوب بیان میں ممتاز ہے تو خلیل کے قصیدے میں خیالات کی گہرائی اور رومانویت جلوہ گر ہے، خلیل نے مصری دیوی "ایمیزیس" کے مجسمے پر ایک بڑا عمدہ اور دلچسپ قصیدہ لکھا ہے۔ مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر کہتا ہے:-

(۱)　مِثَالُ لِإِيزِيسَ فِي صَلْدِهِ　　نُحِسُّ الحَيَاةَ وَ تَجْرِي الدِّمَاءِ

(۲)　بِهِ فَجَّرَ الحُسْنُ مِن مَنْبَعٍ　　فَيَا عَجَباً لِلثَّرَى مَالِ الظِّمَاءِ

(۳)　فُتُونُ الدَّلَالِ وَرَدْعُ الجَلَالِ　　وَ أَمْرُ الحَيَاةِ وَ نَهْيُ الحَيَاءِ

(۴)　فَأَدْرَكْتُ كَيْفَ اِسْتَبَتْ عَابِدِيهَا　　بِسِحْرِ الجَمَالِ وَ سِرِّ الذَّكَاءِ

۱- مجسمہ ایزیس کی پختگی ملاحظہ ہو کر (صدیاں گذر گئیں مگر) اس میں زندگی محسوس کی جا سکتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس میں خون گردش کر رہا ہے۔

۲- اس کے طفیل ہی گویا حسن کا سرچشمہ پھوٹا۔ تعجب تو اس ریت پر ہے جو اس دیوی کے درشن کی پیاسی نظر آتی ہے۔

۳- دیکھو! مجسمہ کی ناز و ادا تو دل کو کھینچتی ہے۔ مگر رعب و جلال پیچھے ہٹاتا ہے۔ گویا زندگی کی ترغیب اور حیا کی رکاوٹ ایک ساتھ جمع ہو گئی ہے۔

۴- اس مجسمہ میں یہ باتیں دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ اس حسن و جمال کی دیوی نے اپنی خوبصورتی کے جادو اور پراسرار ذہانت سے کس طرح اپنے پرستاروں کو اپنا اسیر بنا لیا۔

فراعنہ مصر کی عظمتوں اور دیوی دیوتاؤں کی پراسرار داستانوں کے گیت گانے والا شاعر جب اہرام مصر کا مشاہدہ کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے قومیت کا جذبہ سو گیا ہے اور عالمگیر انسانی جذبے کی رگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ فرعونوں نے اپنی عظمت و جلال کا سہارا لے کر غریبوں کی غربت اور بے بسوں کی بے بسی کا مذاق اڑایا ہے۔ یہاں وہ فراعنہ کے جاہ و جلال اور عظمتوں کے گیت گانے کی بجائے ان انسانوں پر آنسو بہاتا ہے جن کا خون پسینہ ان فلک بوس چوٹیوں والے اہرام کی تعمیر میں کام آیا۔ شاعر کو اہرام کے آس پاس کی ریت کے ذرات انسانی ڈھانچوں کے بکھرے ہوئے ذرات معلوم ہوتے ہیں جو اس محیر العقول عمارت کی تعمیر میں کام آئے۔

مصر کی جنگ آزادی میں خلیل کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے وہ اپنی ولولہ انگیز نظموں سے مصری قوم کا خون بھی گرماتا ہے اور مصر کے اولوالعزم اور عظیم سپوتوں کو خراج عقیدت پیش کر کے ان کے شاندار کارناموں کے گیت بھی گاتا ہے۔ جب کبھی مصر نے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی یا صنعتی میدان میں کوئی کامیابی حاصل کی یا فیصلہ کن قدم اٹھایا خلیل نے اس کا پرجوشی سے خیر مقدم کیا اور اپنے گیتوں سے مصریوں کے حوصلے بلند کئے۔ مصر کی تحریک آزادی میں جن شخصیتوں نے عظیم الشان قربانیاں دیکر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی ان میں محمد فرید بک، مصطفیٰ کامل اور سعد زغلول کا مقام سب سے بلند اور ممتاز ہے۔ اسی طرح مصر میں تحریک آزادی نسواں کے سلسلے میں قاسم امین اور خاتون مصر ہدیٰ شعراوی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ خلیل مطران نے ان سب کی شان میں قصائد کہے اور ان کے مرثیے لکھے ہیں۔

خلیل مطران فطرت کا پرستار اور پھولوں کا شاعر ہے۔ مگر وہ حسن و عشق کا شاعر بھی ہے —— بلکہ حسن و محبت کا شاعر پہلے ہے اور فطرت کا پرستار اور پھولوں کا شاعر بعد میں۔ حسن کی محبت کے عالمگیر جذبے نے ہی خلیل کو پھولوں، کہساروں اور مرغزاروں، دریاؤں اور حسن فطرت کے دلفریب مناظر کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ اب وہ حسن کا پرستار ہے۔ یہ حسن خواہ کائنات کے کسی گوشے یا ذرے میں ہو، عشق بتاں کے تجربات نے اسے حسن کائنات میں فنا کے مرحلے تک پہنچا دیا ہے۔ غزالوں کی محبت نے اسے صحراؤں کا گرویدہ بنا دیا۔ گلرخوں کے عشق نے اسے پھولوں سے محبت سکھائی اور انسان کی سچی اور خالص محبت نے اسے کائنات کے ذرے ذرے سے قلبی لگاؤ پیدا کر دیا اور فطرت کے حسین و دلفریب مناظر کی محبت میں ڈوب جانے کا سبق دیا ہے۔ گویا غزل گوئی اور نظر بازی خلیل کو شاعر فطرت بنانے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اس لئے سب سے پہلے ہم خلیل کی غزل سرائی اور حدیث حسن و عشق کو لیں تب ہم اسے شاعر فطرت کی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہوں گے۔

غزل و محبت خلیل مطران کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی خلیل نے اس مرغوب موضوع سے منھ نہیں موڑا۔ بلکہ عہد جوانی سے دم واپسیں تک وہ حسن و عشق اور غزل و محبت کی وادیوں میں مست رہا اور سوز و گداز کے ساتھ پیار کے گیت گاتا رہا، اس کا دیوان چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تین چوتھائی دیوان نغمات محبت اور غزل گوئی پر مشتمل ہے۔ خلیل کا کہنا ہے کہ میری شاعری ہی میری باشعور زندگی کی تاریخ ہے۔ اس حساب سے شاعر کی تین چوتھائی زندگی عشق بتاں اور غزل سرائی کی نذر ہوئی!

خلیل مطران کی غزل گوئی اور داستان عشق پر گفتگو کرنے سے پہلے دو باتوں پر توجہ مبذول کرنا مناسب اور مفید ہوگا۔ ایک تو یہ کہ گو عربی شاعری نے اردو اور فارسی کو غزل کی مرغوب اصطلاح اور پسندیدہ صنف سخن دی مگر اردو اور فارسی کے شعرا اس صنف سخن کی پاکیزہ روایت کو باقی نہ رکھ سکے۔ عربی شاعری میں غزل حدیث حسن و عشق کا نام رہا اور وہ بھی صرف صنف نازک سے مگر اس کے برعکس اردو اور فارسی میں گو غزل کا بنیادی تصور حدیث مطرب و مے اور حسن و عشق کی دنیا رہی مگر "پری رخوں" میں صنف نازک کے ساتھ "صنف کرخت" کو بھی شامل کر لیا گیا اور اس "اضافے" سے امرد پرستی یا غزل بالمذکر نے جنم لیا بلکہ عجمی ذوق کے ردعمل کے طور پر عباسی دور کے عرب شعرا جیسے ابو نواس وغیرہ کو بھی یہ مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اسی طرح اردو اور فارسی میں غزل وسیع تر معنی اور مفہوم میں رائج ہوئی اور زندگی کے ہمہ گیر پہلوؤں اور مختلف جذبات و عواطف کے اظہار و تعبیر کا ذریعہ بنی۔

اس موقعہ پر دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ خلیل کی غزل گوئی عربی غزل کی روایت کی پابند بھی ہے اور اس سے آزاد بھی پابند تو اس لحاظ سے کہ خلیل کی غزل جہاں صنف نازک کے حسن و رعنائی کی دنیا تک محدود رہی وہاں اس نے اوزان و قوافی اور قالب و اسلوب میں بھی بڑی حد تک عربی غزل کی روایت کو برقرار رکھا اور آزاد اس لئے کہ مختلف ارتقائی مراحل میں عربی غزل کا موضوع صنف نازک کے ظاہری حسن کی تفسیر، ہجر و وصال کے تذکروں، بیوفائی اور بے رخی کے شکووں تک محدود رہی مگر خلیل کو ان سطحی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ تو فلسفہ محبت کی گہرائیوں میں اترنے کے ساتھ ساتھ محبت کی تقدیس میں بھی رطب اللسان ہے اس کے نزدیک محبت راہ حیات ہے۔ ایک مقدس امانت ہے۔ ایک پاکیزہ فن ہے اور عظمت آدمیت کا زینہ ہے۔

قدیم عربی ادب میں ایک الگ اور مستقل صنف سخن کی حیثیت سے غزل کا وجود نہیں تھا۔ بلکہ قصیدے کے شروع میں شعرا

عشق و محبت کی باتیں کرتے تھے جسے تشبیب، نسیب اور غزل کہا جاتا تھا کیونکہ یہ تینوں الفاظ مترادف المعنی ہیں جو عورتوں سے عشق و محبت کی باتیں کرنا یا ان کے خصائل و محاسن کا تذکرہ کرنے کے معنی دیتے ہیں۔ اموی دور خلافت میں قیس بن ملوح (مجنون لیلی) کُثیّر عزّہ اور جمیل بُثینہ کے ہاتھوں غزل نے ایک خاص رنگ اور مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ مگر عباسی شعراء نے اموی شعرا کی بجائے جاہلی شعرا کی تقلید کو قابلِ ترجیح سمجھا اور غزل تشبیب و نسیب کی شکل میں قصیدے کا ایک حصّہ رہی مگر جدید عربی شاعری میں جہاں قصیدے نے پرانی روش سے انحراف کیا اور تشبیب، گریز وغیرہ تقسیمی قیود سے آزاد ہو کر مستقل وحدت کی شکل اختیار کی وہاں غزل کو بھی مستقل اور الگ صنف سخن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ آج کی عربی غزل میں جہاں قدیم پاکیزہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے غزل کا موضوع صرف صنف نازک کا حسن و جمال اور اس سے عشق و محبت کے تذکروں کا نام ہے وہاں اس میں مغربی ادب کی عشقیہ شاعری کا رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ مختلف امتیازی خصائص کی بنا پر خلیل مطران کو جدید عربی غزل کا امام ہونے کا شرف حاصل ہے۔

معلوم ہوتا ہے خلیل مطران نے عشق و محبت کے سلسلے میں جاہلی شعرا اور اموی شعرا کے مسالک سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر جاہلی دور کے عرب شعرا کا مسلک یہ تھا کہ اشعار میں محبوبہ کا نام ضرور لیا جائے مگر وہ کبھی کبھی ایک محبوبہ کا نام لینے کی بجائے بہت سی محبوباؤں کے نام ذکر کر دیتے تھے یا یوں کہیے کہ صاف طور پر محبوبہ کا نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے اس لئے اپنی محبوبہ کو کئی ناموں سے یاد کرتے تھے تاکہ لوگوں کے "شر" سے محفوظ رہ سکیں مگر اموی دور میں شعرا کی ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جو فنافی المحبوبہ ہو گئی۔ لوگوں کے شر کی کوئی پروا نہ کی، محبوبہ کا نام اس کے قبیلے کا نام حتیٰ کہ بعض رشتہ داروں کا نام بھی لیا اور عشق میں ایسے ثابت قدم رہے کہ عربی غزل کے وسیع سرمایہ کے علاوہ عشق و محبت کی زندہ جاوید مثالیں چھوڑ گئے۔ خلیل اس لحاظ سے تو جاہلی شعرا کے طریقے کو پسند کرتا ہے کہ محبوبہ کو بدنام نہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنی محبوبہ کو کبھی ہند، کبھی سلمیٰ کبھی لیلیٰ کے مختلف ناموں سے یاد کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اس طرح ایک تو وہ بدنام نہ ہو گی دوسرے لوگوں کو جدائی ڈالنے کا موقعہ نہ مل سکے گا۔ وہ کہتا ہے۔

كتمتُ هواكِ دهراً لا لخوفٍ ۔۔۔ وما أنا من يروّعه الحِمام
ولكنّي حرصتُ عليكِ منهم ۔۔۔ ولو أودى بمهجتيَ الغرام

(۱) تمام عمر تیری محبت کو چھپاؤں گا لیکن خوف کی وجہ سے نہیں کیونکہ میں تو موت سے بھی نہیں ڈرتا۔
(۲) مگر مجھے تیرا ڈر ہے کہ لوگ تجھے نہ بدنام کریں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ محبت چھپانے سے میری جان چلی جائے گی۔

لیکن اس لحاظ سے خلیل اموی دور کے غزل گو شعرا کے مسلک کو پسند کرتا ہے کہ غزل قصیدے سے الگ ایک خاص اور مستقل صنف سخن ہے۔

خلیل نے اپنی داستان عشق کو ایک قصیدے میں قلمبند کیا ہے۔ جو اس کے دیوان میں "حکایۃ عاشقین" (دو عاشقوں کی کہانی) کے عنوان سے موجود ہے۔ فسانہ عشق و محبت کا آغاز قاہرہ کی ایک سیرگاہ میں عجیب ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے۔ گلشن کی سیر کرتے ہوئے ملاقات ہو جاتی ہے۔ اچانک حسینہ کے رخسار پر شہد کی مکھی ڈنک مارتی ہے۔ انسانی ہمدردی سے سرشار ہمارا یہ شاعر حسینہ کے زخم کو سہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ شاعر کے جسم میں محبت کی تپش ایک بجلی کی لہر کی طرح دوڑنے لگتی ہے خواب و خیال اور شعر کی دنیا کی ملکہ اس کے سامنے ہے۔ وہ یہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ

کائنات کی نبضیں رُک جائیں۔ وہ دونوں محبت کی روشنی اور عشق کے نشے میں فضاؤں میں روحیں بنکر یا دو پرندوں کی مانند اُڑنے لگیں۔!

اب کیا تھا! محبت کے پاکیزہ رشتوں نے دو دلوں کو ایک کر دیا، عاشق چپکے چپکے چوری چھپے قاہرہ کے گرد و نواح میں رات کے وقت اپنی محبوبہ سے ملتا رہا اور ایک مدت تک حسن و عشق کے ملاپ کے یہ سلسلے یونہی جاری رہے — ان ملاقاتوں کے دوران کی گفتگو بھی بڑی پیاری اور دلچسپ ہوتی تھی۔ مثلاً ایک دفعہ محبوبہ دریافت کرتی ہے کہ عورت کے لئے کونسا لباس زیادہ موزوں اور بہتر ہوتا ہے؛ سفید یا سیاہ؟ تو شاعر عجیب کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا اور اس شش و پنج میں پڑنے کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ جب تم سفید لباس زیب تن کرتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے صبح کے وقت سورج نکل رہا ہو اور جب سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہوتی ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت سیاہ آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا ہو اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا میرے لئے مشکل ہے۔ کہتا ہے:-

إِذَا مَا تَرَدَّيْتِ الْبَيَاضَ لِتَنْجَلِيَ فَكَالشَّمْسِ يَجْلُوهَا الصَّبَاحُ لِتَسْطَعَا
وَإِنْ تُوءِ ذِرِي سُودَ الْمَطَارِفِ مَلْبَساً فَكَالْبَدْرِ يَخْتَارُ اللَّيَالِيَ مَطْلَعَا

مگر گردش روزگار اور حاسدوں کی نظر سے کون محفوظ رہا؟! راز کھل گیا اور آخر کار چغلخوروں نے غلط فہمیاں پیدا کر کے دو دلوں کو جدا کر دیا۔ محبوبہ قاہرہ سے شام چلی جاتی ہے۔ عاشق زار اس کے گھر کے در و دیوار اور فرش کو بوسے دیتا ہے اور حیران ہو کر سوال کرتا ہے کہ یہ سب کچھ خواب تھا یا آسمان پر ایک بجلی چمکی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی؟ یوں عشق کا یہ ڈراما المیہ اختتام کو پہنچتا ہے اور عاشق نامراد چغلخوروں کا ماتم کرتے ہوئے محبوبہ سے کہتا ہے۔

فَيَا وَرْدَتِي مَاذَا أَحَالَكِ جَمْرَةً وَيَا جَنَّتِي مَاذَا أَصَارَكِ نَارَا

اے میرے گلاب کے پھول! تجھے دہکتا ہوا انگارہ کس نے بنا دیا اور اے میری جنت! تجھے جہنم میں کس نے بدل دیا ہے؟!

عشق کے اس ناکام تجربے کے بعد شاعر گو ہر قسم کے حسن کا مداح اور پرستار رہا مگر دل اسی پہلی محبت کی سرد اور سرد ر آمیز اذیت ناک آگ میں ہی جلتا رہا اور تمام عمر تجرد میں گذار دی شاعر کا کہنا ہے کہ یہی شعلہ محبت اسی کی زندگی کا سرمایہ، کمال فن کا زینہ اور روشنی کا مقدس مینار ہے۔

خلیل مطران اس نظریئے سے متفق نظر آتا ہے کہ محبت عظمتوں اور بلندیوں کا زینہ ہے اور ہر عظیم انسان کے پیچھے کوئی نہ کوئی باکمال عورت رہی ہے۔ شاعر کے نزدیک محبت نہ صرف انسانی عظمت کا راز ہے بلکہ زندگی کا مقصود اصلی اور غرض و غایت بھی یہی ہے۔ اس کے بغیر روح انسانی کی تکمیل ناممکن ہے۔ وہ کہتا ہے:-

وَالْحُبُّ أَلْزَمُ لِلْأَرْوَاحِ مَا عَظُمَتْ وَقَدْ يَكُونُ لَهَا أَدْعَى إِلَى الْعِظَمِ

ترجمہ:- روح انسانی خواہ عظمت کے کسی درجے میں کیوں نہ پہنچ جائے محبت اس کے لئے لازم اور ضروری ہے اور کبھی تو محبت ہی روح انسانی کو عظمتوں کی طرف لے جاتی ہے۔

خلیل کا کہنا ہے کہ جو محبت سے محروم رہا وہ راز ہستی سے غافل رہا:-

مَن لَم یُحِبّ فَمَا الصَّفاءُ لَہٗ   صَفوٌ وَمَا الکَدَرُ بِہٖ کَدَرٌ
یَنجابُ عَن وَجہِ الحَیاۃِ کَمَا   تَنجابُ عَن مِرآتِھا الصُّوَرُ

(۱) جس نے محبت نہیں کی اسے خوشگوار و ناخوشگوار کا کیا علم ؟

(۲) وہ سطح زندگی سے یوں گزر جاتا ہے جس طرح آئینہ کی سطح پر سے صورتیں گذر جاتی ہیں !

اکثر شعرائے عرب ہمیشہ نسوانیت کے ظاہری حسن و جمال کے پرستار اور دلدادہ رہے ہیں ۔ بس ہر شاعر کی محبوبہ کا چہرہ سورج یا چاند کی مانند ہے ۔ بال رات کی طرح سیاہ ، پیشانی صبح روشن ، دانت گل بابونہ ، رخسار گلاب کی پتیاں ۔ آنکھیں ہرن کی سی اور قد نیزے یا صنوبر کا سا ، باطنی خوبیوں کی طرف دھیان کم ہی جاتا ہے ۔ بلکہ باطن میں تو وہ بے وفائی اور بے رحمی ایسے خصائل بد سے متصف ہوتی تھی مگر خلیل کی محبوبہ ظاہری اور باطنی خوبیوں سے متصف ہے ۔ اسے جہاں اپنی محبوبہ کا حسن و جمال فریفتہ کئے ہوئے ہے وہاں اس کی عقل و بردباری اور عفت و حیا بھی گرویدہ کئے ہوئے ہے ۔ شاعر کی محبوبہ کو دیکھئے ۔

فَتَاۃٌ کَمَا تَھوَی النُّفُوسُ جَمِیلَۃٌ   مُنَزَّھَۃٌ عَن رِیبَۃٍ وَتَصَنُّعِ
بَیَاضٌ یَغَارُ العَاجُ مِنہُ نَقَاوَۃً   وَتَحجُبُہٗ لَونُ الحَیَاءِ کَبُرقُعِ
وَعَینَانِ سَودَاوَانِ یَنھَلُ مِنھُمَا   ضِیَاءٌ کَمَسکُوبِ الرَّحِیقِ المُشَعشَعِ
تَخَالُ مُحَلَّاۃً وَمَا ثَمَّ مِن حُلِیٍّ   سِوَی اَدَبٍ وَفرٍ وَحُسنٍ مُمَنَّعِ

(۱) وہ دلوں کو بھانے والی حسین دوشیزہ ہے ۔ وہ تصنع اور مشکوک باتوں سے پاک ہے ۔

(۲) اس کے سفید رنگ پر ہاتھی دانت کو رشک آتا ہے اور اسی سفید رنگت کو حیا کا برقع چھپائے ہوئے ہے ۔

(۳) اس کی آنکھیں دو سیاہ چشمے ہیں جن میں سے بہتے ابلتے ہوئے شراب کی سی روشنی پھوٹ رہی ہے ۔

(۴) وہ تمھیں آراستہ نظر آئے گی حالانکہ اس کے پاس سوائے کمال ادب و حسن کے کوئی زیور نہیں ۔

گویا خلیل کی محبوبہ ایک مثالی عورت ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک خیالی عورت ہے یا اور زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ خلیل عورت کو اس رنگ میں دیکھنے کا متمنی ہے ۔ ایسا حسن و جمال اور اخلاق و کمال جس کی تصویر وہ ایک بلند نظر فنکار اور پختہ فکر شاعر کی حیثیت سے الفاظ میں بند کر کے پیش کر رہا ہے ۔

زمان و مکان کسی فرد کی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی عناصر کی حیثیت سے پوری طرح اثر انداز ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں معاشرتی ماحول انسان کی شخصی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ انسان کو جس قسم کی فضا اور ماحول میسر آتا ہے اس فضا اور ماحول میں اسے جس قسم کے مشاہدات و مناظر دیکھنے اور سوچنے اور فکر کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں اسی کے مطابق اس میں ذہنی اور فکری صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ تخلیقی کارنامے انجام دینے کے قابل ہو سکتا ہے ۔ خلیل اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ۔ اس نے ظلم و استبداد اور ذلت و غلامی کے ماحول میں آنکھ کھولی ۔ اس لئے اس کے دل میں ظلم و غلامی کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی ۔ عرب قومی کی عزت و خوشحالی کا جذبہ موجزن ہوا اور غریبوں اور بیکسوں سے ہمدردی پیدا ہوئی ۔ اس نے حسین مناظر فطرت کی سرزمین اور پری رخوں کے دیس لبنان میں جنم لیا اس لئے حدیث حسن و عشق سے دلچسپی ، حسیناؤں سے پیار اور فطرت کے دلفریب و دلکش مناظر سے قلبی لگاؤ پیدا ہوا ۔

مناظر فطرت خلیل مطران کی شاعری کا ایک اہم موضوع رہے ہیں ۔ اور اس قسم کے قصائد اور قطعات سے

اس کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ وہ فرانس اور انگلستان کے رومانوی شعرا سے متاثر بھی ہے اور ان کی نیچرل شاعری کا تتبع بھی کرتا ہے۔ مگر وہ اندھی تقلید سے ہمیشہ متنفر رہا ہے۔ بودلیر، کالرج اور ورڈز ورتھ کی طرح مشاہد فطرت اور دیہات کی سادہ زندگی کی تقدیس بیان کرتے ہیں وہ صرف حیات بخش سکون اور روح پرور سرور ہی تلاش نہیں کرتا بلکہ فطرت کو اپنا ہمراز و غمگسار بھی پاتا ہے۔ کائنات کی مختلف اشیا اور مظاہر فطرت اس کے نزدیک انسان کی طرح صرف ذی روح ہی نہیں جنھیں گزند پہنچانے سے درد اور تکلیف محسوس ہوتی ہے بلکہ وہ انسانوں کے غمگسار و وفادار ہیں ان کے دکھ درد میں شریک ہیں ان کی تکالیف اور مصیبتوں پر آنسو بہاتے ہیں اور ان کی خوشیوں پر جھوم اٹھتے ہیں بلکہ وہ تو انسان کی خاطر جان بھی دے ڈالتے ہیں۔ خلیل جب مظاہر فطرت کے سامنے کھڑے ہوکر گویاں ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے اس کی ہستی کائنات میں تحلیل ہوتی دکھائی دیتی ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ کائنات کو وہ اپنے وجود میں سمو لیتا ہے اور مظاہر فطرت اور عناصر کائنات میں سے کوئی اس کا بازو بن جاتا ہے۔ کوئی آنکھ کوئی زبان اور کوئی آنسو اور اس طرح خلیل اور فطرت میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شاعر فطرت کی حیثیت سے خلیل نے جو کچھ کہا اور لکھا ہے ان میں دو قصیدے "قلعہ بعلبک" اور "المساء" (شام) خصوصی توجہ کے مستحق اور بہترین تصانیف شمار کئے جاتے ہیں۔ قلعہ بعلبک دنیا کے عجائبات میں سے ہے مورخین اس کے بارے میں حیران نظر آتے ہیں۔ آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کی تعمیر کس طرح ہوئی اور کون سے اوزار اس کی تعمیر میں کام آئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ حضرت سلیمان نے تعمیر کرایا تھا۔ اسلامی فتوحات کے بعد قرون وسطیٰ کی جنگوں میں اس قلعے نے بڑا اہم اور تاریخی کردار ادا کیا۔ بعلبک خلیل کی جائے پیدائش ہے۔ اس نے قلعہ بعلبک کو موضوع بنا کر اپنے بچپن کی معصومانہ یادگاروں کو دوہرانے کے ساتھ ساتھ قلعے کا نقشہ کھینچ کر اس قوم کی عظمتوں کے گیت بھی گائے ہیں جس کی ہمت و قوت نے یہ محیر العقول کارنامہ انجام دیا ہے۔

قصیدہ "المساء" میں خلیل شاعر فطرت کی حیثیت سے انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے اور اس سے اس کا فطرت کے متعلق مسلک و نظریہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں شاعر کو مظاہر فطرت صرف زندہ اور ذی روح اشیا معلوم نہیں ہوتے بلکہ شاعر اور فطرت ایک دوسرے میں پوری طرح گم اور تحلیل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس قصیدے میں خلیل بتاتا ہے کہ میں دو مرضوں میں مبتلا تھا ایک جسمانی اور دوسرا روحانی۔ مرض محبت۔ دوستوں نے مجھے اسکندریہ آنے کا مشورہ دیا تاکہ میں صحت یاب ہو سکوں مگر یہاں آکر دونوں مرض اور بھی بڑھ گئے۔ اب شاعر کے سامنے یہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ وہ فطرت سے اپنے دکھ درد کا شکوہ کرے اور اس پر یہ راز کھلے کہ فطرت تو اس کے غم میں شریک ہے اور اس کے دکھوں پر اشکبار رہی ہے۔ شاعر کو مظاہر فطرت میں اپنے ہر ہر زخم کی تصویر نظر آتی ہے۔ سمندر کی لہریں دراصل اس کے دل کی دھڑکن ہے جو اس کی رنجیدگی خاطر کا پتہ دیتی ہے۔

وَالبَحرُ خَفَّاقُ الجَوانِبِ ضَائِقٌ　　كَمَداً كَصَدرِي سَاعَةَ الإِمسَاءِ

ترجمہ:۔ سوزش درد دل اور دل تنگ ہونے کی وجہ سے سمندر کے پہلو (کنارے) دھڑک رہے ہیں بالکل اسی طرح جیسے شام کے وقت میرے سینے کی کیفیت ہے۔

صفحۂ کائنات پر چھا جانے والی دھندلاہٹ اور تاریکی شاعر کو اپنے دل پر چھاجاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہتا ہے:۔

تَغْشَى الْبَرِيَّةَ كُدْرَةٌ وَكَأَنَّهَا　　صَعِدَتْ إِلَى عَيْنَيَّ مِنْ أَحْشَائِي

ترجمہ :- دنیا پہ ایک قسم کی دھندلاہٹ چھائی ہوئی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے یہ میرے دل کے راستے سے میری آنکھوں کی طرف چڑھ رہی ہے۔

مگر غم کا یہ طوفان اور مظاہر فطرت کی یہ کیفیت شاعر کو اپنی محبوبہ کی یاد سے نہیں روک سکتی اور وہ اس سے کہتا ہے :-

وَلَقَدْ ذَكَرْتُكِ وَالنَّهَارُ مُوَدِّعٌ　　وَالْقَلْبُ بَيْنَ مَهَابَةٍ وَرَجَاءِ

وَخَوَاطِرِي تَبْدُو تُجَاهَ نَوَاظِرِي　　كَلْمَى كَدَامِيَةِ السَّحَابِ إِزَائِي

(۱) میں نے تجھے اس وقت بھی یاد کیا کہ جب دن رخصت ہو رہا ہے اور دل امید و بیم سے دوچار ہے۔

(۲) میرے تخیلات میری نظروں کے سامنے یوں زخمی نظر آتے ہیں جیسے خون کی طرح سرخ بادل میرے سامنے ہیں

شاعر کو یوں لگتا ہے کہ کائنات اس کے غم پر اشکبار ہے اور غروب ہوتا ہوا سورج شفق سرخ کے دامن پر ڈھلکتا ہوا آنسو ہے :-

وَالشَّمْسُ فِي شَفَقٍ يَسِيلُ نُضَارُهُ　　فَوْقَ الْعَقِيقِ عَلَى ذُرًى سَوْدَاءِ

مَرَّتْ خِلَالَ غَمَامَتَيْنِ تَحَدُّرًا　　وَتَقَطَّرَتْ كَالدَّمْعَةِ الْحَمْرَاءِ

فَكَأَنَّ آخِرَ دَمْعَةٍ لِلْكَوْنِ قَدْ　　مُزِجَتْ بِآخِرِ أَدْمُعِي لِرِثَائِي

(۱) سیاہ چوٹیوں پر عقیق کی مانند شفق پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس میں سورج گم ہو رہا ہے۔

(۲) سورج دو بادلوں کے درمیان سے نیچے کی طرف گیا اور سرخ آنسو کی طرح ٹپک پڑا۔

(۳) گویا اشک بار کائنات کا یہ آخری آنسو تھا جو اس نے میری ہمدردی میں میرے آخری آنسو کے ساتھ بہا دیا۔

کائنات کی شام شاعر کو شام زندگی کی یاد دلاتی ہے :-

وَكَأَنَّنِي آنَسْتُ يَوْمِي زَائِلًا　　فَرَأَيْتُ فِي الْمِرْآةِ كَيْفَ مَسَائِي

ترجمہ :- گویا میں نے اپنی زندگی کے زوال کو محسوس کر لیا ہے اور شام کائنات کے آئینے میں اپنی شام کا مشاہدہ کر لیا ہے۔

خلیل کی فطرتی شاعری کا ایک پہلو گل و گلزار کی پرستش اور توصیف بھی ہے۔ پھولوں سے اسے والہانہ عشق تھا اور نرگس تو اس کا پسندیدہ پھول ہے۔ وہ جب بوئے گل اور رنگ گل کے متعلق نالہ دل کے سوز و ساز کے ساتھ نغمہ سرائی کرتا ہے تو قاری پر بے ساختہ مستی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور شاعر کا ہر لفظ گلاب و یاسمین کی مہک، بلبل کا سا آہنگ اور نغمگی اور باد نسیم کی سی مست خرامی کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ خلیل کے دیوان میں آپ کو حسن و عشق کے نغمے اور مظاہر فطرت کے زمزمے بھی ملیں گے اور وہ آپ کو پھولوں کی خوشبو سے مہکتا ہوا بھی نظر آئے گا۔ گل و بلبل اور گلشن و صیاد فارسی اور اردو شعرا کے ہاں بھی مرغوب و مقبول موضوع رہے ہیں۔ ان شعرا کے نزدیک پھول زینت چمن اور مسرت انگیز منظر کا کام دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی تو اپنے محبوبہ کے حسن اور نزاکت کو پھولوں کی رنگت اور نزاکت میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی انھیں پھولوں میں غم الیاس رنگ

نظر آیا جس سے وہ محبوب کے حسن و جمال کو تشبیہ دے سکتے اور نہ سنبل میں انھیں خوشبو مل سکی کہ اس کے بالوں کی خوشبو کا مقابلہ کر سکتی۔ مگر خلیل نے اس موضوع میں بھی جدت پیدا کی ہے۔ وہ پھولوں کو کبھی تو روشنی قرار دیتا ہے جو دکھی انسانوں کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ ایک ایسی روشنی جس میں جلا دینے والے شعلہ کا کبھی کوئی خطرہ نہیں۔ کہیں یہ پھول بدنصیبوں کے لئے خدا کا مقدس اور روحانی پیغام مسرت بن جاتے ہیں۔ حسیناؤں کو پھولوں سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے مگر پھولوں کی کوئی بات حسیناؤں کے مشابہ کسی کو نظر نہ آئی۔ مگر خلیل یہ دیکھتا ہے کہ پھول ایک حسن و حیا کی پیکر دوشیزہ کی طرح شرمیلے بھی ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ پھول انسانی افکار و خیالات اور آرزوں اور امنگوں کے مجسمے ہیں جنھوں نے یہ روپ دھار لیا ہے اور یہ پھول شبنم کے قطروں، زمین کی تھپکیوں، ہواؤں کی لوریوں اور ستاروں کے نور سے پرورش پاتے ہیں۔

خلیل کو نرگس کا پھول بہت پسند تھا۔ وہ اسے صبح کی مسکراہٹ کا نام دیتا ہے وہ خالق کائنات کا اعجاز ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ملاء اعلیٰ کی روحانی مخلوق زمین پر اتر پڑی ہے۔

إِنَّهَا النَّرْجِسُ ابْتِسَامَةُ فَجْرٍ　　أَلْطَفَتْ نَسْجَهَا يَدُ الرَّحْمٰنِ

قَامَ فِي حُلَّةِ الْبَيَاضِ فَكَانَتْ　　ثَوْبُ رُوحٍ لَا ثَوْبُ جِسْمٍ فَانِي

(۱) گل نرگس صبح کی مسکراہٹ ہے جسے خدا کی لطیف قدرت خلاق نے تیار کیا ہے۔

(۲) وہ سفید لباس میں یوں نظر آیا۔ جیسے اس پر فانی جسم کے لباس کی بجائے غیر فانی روح کا لباس ہے

نرگس کا پھول اس کے نزدیک محبت و وفا کا مظہر بھی ہے۔ وہ اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر ایک عجیب غریب حکایت نظم کرتا ہے "امینہ" ایک حسین اور معصوم دوشیزہ ہے۔ اس کا محبوب جب جہاد پر روانہ ہوتا ہے تو وہ اپنے آنگن میں نرگس کا پودا لگا لیتی ہے اور اس کی خوب دیکھ بھال کرتی ہے کیونکہ یہ اس کی محبت کی یاد ہے ایک دن اچانک اسے اپنے محبوب کی شہادت کی خبر ملتی ہے۔ وہ یاس و حسرت کے آنسو بہاتے ہوئے صحن میں داخل ہوتی ہے تو نرگس کا پودا خشک ہو چکا ہوتا ہے اور اس کے پتے ادھر ادھر بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔

دیہات اور دیہاتی زندگی رومانوی شعرا کا موضوع رہی ہے۔ خلیل نے بھی دیہات اور دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مناظر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور انگریزی و فرانسیسی ادبیات کی طرح عربی ادب کو بھی اسی نوع کی شاعری کا ایک وسیع اور قیمتی سرمایہ شعر دیا ہے۔

خلیل مطران نے ایک اور صنف سخن میں بھی کمال پیدا کیا ہے اور وہ ہے قصصی اور غنائی شاعری، اس کے دیوان میں اسی نوع کے قصائد کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اس میدان میں اس نے اپنا موضوع کبھی تو مشرق و مغرب کے تاریخی حوادث و واقعات میں سے منتخب کیا ہے اور کبھی معاشرتی زندگی کے نقوش کو لیا ہے اور سمند فکر کی جولانیاں دکھلاتے ہوئے قصص اور غنائی شاعری کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔

قدیم عربی ادب گو اس نوع کی شاعری سے یکسر خالی نہ تھا بلکہ حماسی شاعری اور حطیئہ شاعر کے بعض قصائد میں اس کے نمونے مل جاتے ہیں اس کے علاوہ ابن عبدربہؒ نے عبدالرحمان الناصر کے شاندار کارناموں کو شعر کا جامہ پہنایا اور لسان الدین الخطیب نے اپنے عہد تک کی اسلامی تاریخ کو نظم کیا تاہم عربوں کے ہاں الیاذہ، اودیسا

شاہنامہ اور مہابھارت ایسے شاہکار نہ تھے۔ مگر جدید عربی ادب میں اس قسم کی شاعری کی کمی نہیں اور شعرا نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلیمان البستانی نے ہومیرس کی الیاذہ کا شعروں میں ترجمہ کیا۔ احمد شوقی نے " الحوادث فی وادی النیل " کے عنوان سے ایک طویل قصیدے میں مصر کی تاریخ کو نظم کیا۔ احمد محرم نے غزوات رسول کو موضوع بنا کر حفیظ جالندھری کی طرح شاہنامہ اسلام لکھا اور خلیل مطران نے کئی ایک طویل قصائد نظم کئے جن میں " قصیدہ نیرون " سب سے عمدہ قصیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قصیدہ کا موازنہ بلاشبہ مغرب کی ایپک شاعری کے شاہکاروں سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ چارسوتیس اشعار پر مشتمل ہے اور ایک ہی بحر اور ردی میں نظم کیا گیا ہے۔

تاریخ روما میں " نیرو " ایک جابر و مستبد آمر کی حیثیت سے ممتاز و مشہور حیثیت کا مالک ہے یہ وہی نیرو ہے جو بانسری بجاتا رہا اور روم جلتا رہا تھا۔ شاعر نے اس آمر مطلق کے جور و ستم، فساد و تباہی اور روما کی مشہور آتشزدگی کو موضوع بنایا ہے۔ خلیل اس قصیدہ میں رمزیت کا سہارا لے کر اقوام مشرق کو روح آزادی سے روشناس کرا کر انھیں اپنے ظالم اور مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف انقلاب پر اکسانا چاہتا ہے۔ قصیدے کا آغاز و انجام شاعر کے مقصد کو عیاں کئے دیتا ہے مثلاً وہ قصیدے کے آخر میں کہتا ہے کہ آمر پیدا نہیں ہوتے بلکہ قوموں کی کمزوری انھیں جنم دیتی ہے۔ طاقتور قوم کبھی آمر کو برداشت نہیں کر سکتی وہ کہتا ہے :-

کُلُّ قَوْمٍ خَالِقُوْ نَیْرُوْ نِہِمْ قَیْصَرٌ قِیْلَ لَہُ اَمْ قِیْلَ کِسْریٰ

ترجمہ :- ہر قوم اپنے " نیرو " کی خود خالق ہے۔ اسے قیصر کہا جائے یا کسریٰ کا نام دیا جائے۔

خلیل مطران نے " الجنین الشہید " (شہید حمل) کے عنوان سے چارسو شعر کی ایک مخمس لکھی ہے۔ جس میں اپنے دور کے معاشرتی نقوش کو جمع کیا ہے۔ یہ مخمس تکنیک کے لحاظ سے ڈرامے کے تمام خصائص کی حامل ہے۔ الجنین الشہید کا موضوع ایک غریب لڑکی ہے۔ خلیل نے اس میں بتایا ہے کہ دولت کس طرح غربت کو اپنے سامنے جھکاتی ہے اور کس طرح نسوانیت اپنی کشمکش میں مرد کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ایک غریب دوشیزہ لیلیٰ اپنے تنگدست والدین کی خاطر شراب خانے میں ملازم ہوتی ہے۔ تمام شرابی دوشیزہ سے اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے بیتابی دکھلاتے ہیں مگر وہ ان کی آتش طلب کو بھڑکاتی چلی جاتی ہے۔ کہانی میں جذبات کی نفسیاتی کشمکش سے شاعر نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ آخرکار سب شرابی مایوس ہو جاتے ہیں مگر ایک عیاش اور ضدی امیرزادہ جمیل اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا دوشیزہ کبھی اسے جُل دیتی جاتی ہے مگر بالآخر عورت مرد کے سامنے سپرانداز ہو جاتی ہے جمیل اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد لیلیٰ کو ٹھکرا دیتا ہے۔ لیلیٰ پر وہ وقت آجاتا ہے جب عورت کے گناہ کو زبان ملا کرتی ہے۔ وہ اپنی بدنامی کو چھپانے کے لئے اسقاط حمل پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ایک سال کے عرصے میں یہ المناک حادثہ لیلیٰ اور جمیل کی زندگی سے یوں محو ہو جاتا ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا مگر جب کبھی دونوں کی اتفاقیہ نظریں چار ہو جاتی ہیں تو وہ دو شہیدوں (یعنی بکارت اور حمل) کی یاد میں ایک دوسرے کو حسرت بھرے تبسم کے ساتھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

خلیل کے دیوان میں غنائی شاعری کے اور بھی بہت سے عمدہ نمونے موجود ہیں جن میں " شہید مروت و شہید عشق " " پھول کی مہک " اور " قہوے کی پیالی " کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی۔

اسلوب نگارش اور انداز بیان کو شعر و ادب کی دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اسلوب فکر و تصویر اور اظہار و تعبیر کا وہ طریقہ ہے جس میں شاعر یا ادیب کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے اور یہ اس کی خدا داد ذہنی صلاحیت و انفرادیت کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شاعر یا ادیب اپنے افکار و خیالات کو قارئین تک پہنچانے کے لئے انھیں الفاظ و کلمات کا جامہ پہنانے کا محتاج ہے۔ یہ جامۂ الفاظ یا اسلوب نگارش جس قدر بے ساختہ، منفرد اور دلکش ہوگا۔ اسی قدر فنکار کی عظمت و کمال کا سکہ قارئین کے ذہن پر بیٹھ جائے گا۔ گویا الفاظ جسم ہیں اور افکار و معانی روح۔ جس طرح اچھی اور پاکیزہ روح خوبصورت اور موزوں جسم کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح بلند افکار کو اچھے اور موزوں الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح معنی و فکر سے عاری الفاظ محض مداری کا تماشہ ہوتے ہیں اسی طرح اگر الفاظ بھدے اور ناموزوں ہوں تو عمدہ اور بلند افکار بے اثر اور بے مزہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

خلیل مطران اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا اس نے مغرب کے اساتذۂ فن کے اسلوب اور انداز بیان کا گہرا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے سنہری زمانوں کے مشہور شعرا و ادبا کے فنی کمالات اور اسالیب نگارش کا بھی وسیع اور بغور مطالعہ کیا تھا اسے عربی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا اور اسی وسیع مطالعہ اور زبردست عبور کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ ایک ہی قافیہ اور ردی میں چار چار سو اشعار کے بلند پایہ قصائد لکھتا چلا جاتا تھا اسے موزوں اور مناسب الفاظ کے انتخاب میں بڑی مہارت اور کمال حاصل تھا۔ جس طرح اس کے افکار بلند اور معانی اچھوتے ہوتے تھے اسی طرح اس کے الفاظ بھی پرکشش اور شیریں ہوتے تھے۔ موقعہ کی مناسبت سے وہ الفاظ یوں چن چن کر نظم کرتا تھا جس طرح ایک ہنرمند جوہری موتیوں کی لڑیاں پروتا چلا جاتا ہے۔ رعب و جلال اور شوکت و سطوت کے مضامین ادا کرنے کے لئے پرشکوہ اور ہیبت سے لبریز تراکیب، پیار و محبت کے معانی ادا کرنے کے لئے نرم اور نازک الفاظ اور معمولی مواقع پر سادہ کلمات استعمال کرنے میں خلیل اپنا جواب آپ تھا۔ پھر ان الفاظ کی ہم آہنگی اور موسیقیت افکار و معانی کو قوت سامعہ کے راستے بڑے خوشگوار طریق سے قارئین کے دل کی گہرائیوں میں اتار دیتی ہے۔

خلیل کو اچھوتی تشبیہات لانے استعارہ و مجاز اور محسنات لفظیہ کے بیساختہ استعمال میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ اس نے عربی شاعری کی روایتی صنائع و بدائع سے نفرت کی حد تک اجتناب کیا۔ کیونکہ زندگی اور فن کے کسی مرحلے یا کسی پہلو میں بھی تکلف و تصنع کا اظہار اس کے گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھا۔ لیکن جس طرح اس کی خداداد صلاحیت اور خلاق ذہن عمدہ معانی اور بلند افکار کی تخلیق پر کامل قدرت رکھتا تھا اسی طرح تکلف و تصنع سے پاک تشبیہات و استعارات اور دیگر لوازمات فن کے استعمال پر بھی اسے قدرت حاصل تھی الفاظ کا بیساختہ پن۔ آہنگ اور موسیقی ملاحظہ ہو۔

مِزَاجٌ رَقِیْقٌ وَجِسْمٌ نَحِیْفٌ   وَقَلْبٌ رَقِیْقٌ وَ ظِلٌّ خَفِیْفٌ
وَلَفْظٌ لَعُوْبٌ وَلَحْظٌ وَثُوْبٌ   وَعَقْلٌ رَصِیْنٌ وَرَائٌ حَصِیْفٌ

خلیل مطران فنافی الفن شعرا میں سے تھا جن کا اوڑھنا بچھونا بلکہ مقصد حیات ہی فن قرار پاتا ہے اور جو فن کی خاطر جیتے ہیں اور فن کی راہ میں ہی جان دیتے ہیں اور دنیا و مافیہا حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے بھی غافل اور بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ عہد طفولیت سے ہی خلیل کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہو گیا تھا اور ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور انھیں جلا

بخشنے کے لئے وہ اپنی تمام قوتوں اور دیانتدارانہ محنت کو بھی بروئے کار لایا۔ قدیم عربی ادب کے وسیع اور گہرے مطالعہ سے اس نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا اس کے بعد مغربی آداب کا ہمہ پہلو اور گہرا مطالعہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے کتاب فطرت کے فہم و ادراک میں بھی بڑی عرق ریزی اور انہماک سے کام لیا۔ اس کی مرغوب تفریحی غذا اور پسندیدہ مناظر بہار کے موسم میں سُرخ رنگ کے پھول، سنبل و یاسمن کی مہک، فلک بوس پہاڑ۔ لہلہاتے کھیت۔ اور سبزہ زار اور غروب آفتاب کے وقت سمندر کے کناروں پر شفق سُرخ کی سحر سامانیاں ہیں۔

آغاز حیات میں ہی اسے ایک ایسے گھرانے سے وابستگی کا موقعہ مل گیا تھا جو علم و ادب کا مرکز اور فکر و فن کا گہوارہ تھا اور یہ تھا نصیف الیازجی (۱۸۰۰ - ۱۸۷۱) کا علمی گھرانہ۔ نصیف نے عربی زبان کے احیا، ممتاز عرب شعراء کے تعارف اور جدید عربی ادب کی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی خاندان کے ایک نامور فرزند خلیل الیازجی نے ہمارے اس عظیم شاعری کی فکری اور ذہنی تربیت میں بڑا اہم کام کیا اور اس میں نہ ختم ہونے والی تڑپ اور کبھی نہ سیر ہونے والا ذوق پیدا کر دیا۔ خلیل مطران کے لئے الیازجی وہی حیثیت رکھتا ہے جو علامہ اقبال کے لئے مولوی میر حسن کو حاصل ہے فرق صرف یہ ہے کہ مولوی میر حسن اقبال کے طفیل زندہ ہے مگر الیازجی خلیل مطران کے طفیل بھی اور اپنے زندہ جاوید کارناموں کے طفیل بھی ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا۔

عربی زبان کے علاوہ خلیل مطران کو فرانسیسی زبان و ادب پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ شام و لبنان کے علاقے چونکہ فرانس کے زیر اثر رہے ہیں اس لئے وہاں آج تک فرانسیسی کا رواج عام ہے۔ بیروت میں تعلیم کے دوران ہی خلیل کو ایک فاضل فرانسیسی اُستاد میسر آگیا تھا پھر جب وہ پیرس میں گیا تو اس میدان میں مزید کام کرنے کا موقع ملا اور اس نے وہاں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کیا اور پیرس کے علمی اور ادبی حلقوں کو قریب سے دیکھا۔ خلیل نے فرانسیسی میں بے شمار نثری کارناموں کے علاوہ اچھے اشعار بھی کہے ہیں۔ اور فرانسیسی اور دیگر مغربی زبانوں سے تراجم بھی کئے ہیں۔ ان تراجم کے متعلق ڈاکٹر زکی طلیمات کا کہنا ہے کہ میں نے خلیل کے ان تراجم اور اصل دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے دونوں میں اتنی قریبی مماثلت نظر آئی کہ میرے نزدیک یہ مقولہ باطل ہو گیا ہے "إنَّ التَّرجَمَةَ هِيَ الخِيَانَةُ" ترجمہ تو ایک خیانت ہے۔

آپ نے دیکھا کہ خلیل مطران کے فن کو دو مختلف لہریں توانائی اور سیرابی بخشتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک لہر تو عربی ادب کے قدیم ذخائر سے اُٹھتی ہے اور دوسری لہر کا سرچشمہ مغربی ادب ہے۔ فطری صلاحیت کے علاوہ وہ محنت و جانفشانی پر بھی پختہ ایمان رکھتا تھا۔ اپنے کلام کی چھان پھٹک اور صقل و تنقیح میں اس نے کبھی کمی نہیں آنے دی اس لحاظ سے وہ عربی ادب کے ایک قدیم مکتب فکر کے نظریئے کا قائل نظر آتا ہے جو شعر کی چھان پھٹک کا بڑے شد و مد سے قائل ہے اور جس کی بنیاد زمانہ قبل از اسلام میں زہیر بن ابی سلمیٰ کے ہاتھوں پڑی تھی۔ قدیم عرب شعرا کی تقلید اور مغربی شعرا کی نقالی میں لکیر کا فقیر بننے کی بجائے اس نے اپنے لئے بالکل نئی اور اچھوتی راہیں تلاش کی ہیں اس نے عربی و مغربی ادب و ثقافت سے استفادہ کرنے میں بلاشبہ کوئی کمی نہیں آنے دی مگر اس کا فن صرف اس کا اپنا فن ہے۔ خلیل کی شاعری میں قدیم عربی فصاحت و بلاغت اور جدید مغربی افکار و معانی تو آپ کو ضرور ملیں گے مگر اس میں تقلید جامد اور کورانہ نقالی کا شائبہ تک نظر نہ آسکے گا۔ اس نے جہاں عربی قصیدے کو پرانی قیود

دانتشار سے نجات دلاکر مکمل وحدت کی شکل میں پیش کیا۔ دہاں عربی شاعری میں جدید اصناف سخن کا اضافہ کیا اور عربی زبان کو نئی توانائی اور قوت اظہار بخشی وہاں مغربی شاعری کے موضوعات کو بھی بیمثال کامیابی کے ساتھ اپنایا ہے۔ مگر ان موضوعات کو اپناتے وقت جہاں اس نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا وہاں مشرقی اور عربی ذوق کو بھی فراموش نہیں کیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہہ اور لکھ رہا ہے وہ عربی زبان میں اور مشرقی ذوق کے لئے لکھ رہا ہے یہ بات بلاشبہ اس کے قوی ومضبوط ذہن اور اعلیٰ فطری صلاحیت کی دلیل ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے زمانے کے ممتاز ومشہور شعرا شوقی اور حافظ پر فوقیت رکھتا ہے۔ احمد شوقی نے بلاشبہ قدیم عربی ادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسے فرانسیسی ادب سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ تھا مگر وہ مغربی ادب کی گہرائیوں میں نہ اتر سکا تھا۔ حافظ ابراہیم مغربی ادب سے برائے نام واقفیت رکھتا تھا۔ عربی ادب کے مطالعہ میں گو اس نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا۔ مگر محنت کے ساتھ فطری صلاحیت بھی درکار ہوتی ہے جو حافظ کے حصے میں کم آئی تھی۔ لیکن خلیل مطران عربی ومغربی آداب کے سرچشموں سے خوب سیراب ہوا۔ ان کی گہرائیوں میں اُترا پھر منجھی ہوئی طبیعت اور پختہ فکر کے طفیل اپنے فن کی تخلیق کے لئے نئی اور اچھوتی راہیں پیدا کیں۔

خلیل مطران اپنے معاصر شعرا پر اس لحاظ سے بھی فوقیت رکھتا ہے کہ وہ جدید عربی ادب میں ایک کثیر الاثر اور مستقل دبستان شعر کا بانی اور امام ہے۔ ایک ایسا مکتب فکر جس کی تعمیر وتربیت میں قدیم وجدید کے حسین امتزاج کے زندہ نقوش موجود ہیں۔ اسی مکتب فکر نے قدیم عربی ادب سے تو فصاحت و بلاغت اور فنی روایات حاصل کیں اور مغرب سے جدید افکار لئے۔ خلیل کے دبستان شعر کی ممتاز خصوصیت رومانویت ہے۔ ایک تو رومانویت کی دلکشی نے اور دوسرے خلیل کی ہمہ گیر شخصیت نے نوجوان عرب شعرا کی ایک بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا اور وہ اس کے گرد جمع ہو گئے حتیٰ کہ اس کے معاصر بھی اس سے اصلاح لیتے رہے۔ علی محمود طہ، ابراہیم ناجی، خلیل شیبوب، البشارۃ الخوری اور احمد زکی ابو شادی اس کے نامور تلامذہ اور پیروکار ہیں۔ یہ سب شعرا اصحاب دواوین ہیں اور جدید عربی شاعری میں ہر ایک اپنی جگہ بلند اور ممتاز شاعر شمار ہوتا ہے۔

امدادی کتابیں

۱۔ الادب العربی المعاصر فی مصر ۔ ڈاکٹر شوقی ضیف

۲۔ الادب العربی المعاصر فی سوریا ۔ سامی الکیالی

۳۔ فی الادب الحدیث (دو جلد) ۔ عمر الاسوقی

۴۔ الکتاب الذھبی لمھرجان الخلیل ۔ ــــــــ

۵۔ دیوان الخلیل (چار جلد) ۔ خلیل مطران

۶۔ الفن ومذاھبہ فی الشعر العربی ۔ شوقی ضیف

۷۔ شعراء الوطنیۃ ۔ عبد الرحمن الرافعی

۸۔ حافظ وشوقی ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین

۹۔ ادب المھجر ۔ عیسیٰ الناعوری

۱۰۔ شاعر الاقطار العربیہ ۔ ڈاکٹر جمال الدین

۱۱۔ شعراء مصر ۔ عباس محمود العقاد

۱۲۔ رسالہ الہلال قاہرہ کے بعض شمارے

لکھنؤ میں اُردو

(گزشتہ سے پیوستہ)

باقر شمس لکھنوی

مسلمانوں میں سب سے پہلے ایرانیوں نے اسلامی علوم کے ساتھ فلسفہ میں بھی کمال پیدا کیا اور اسے گمراہی کے بجائے ہدایت کا باعث جانا اور حدیث و تفسیر کے ساتھ حکمت و فلسفہ کے بھی دریا بہائے۔

میر باقر داماد۔ ملا صدرالدین شیرازی۔ محقق طوسی میر فتح اللہ شیرازی ایسے ہی بحر ناپیدا کنار تھے۔

میر فتح اللہ شیرازی ہندوستان کی علمی تاریخ کے مبداء ہیں انھیں سے ہندوستان میں علوم عقلیہ کا ایک نیا باب کھلا مورخ فرشتہ لکھتا ہے۔

ان کے علم و فضل کی شہرت سن کے علی عادل شاہ نے صدہا آرزوں سے لاکھوں روپیہ خلعت و انعام بھیج کر شیراز سے بلوایا اور امارت و اعزاز سے رکھا ۹۸۸ھ میں ابراہیم عادل شاہ انھیں کی تدبیروں سے تخت و تاج کا مالک بنا۔

اکبر کو جب ان کے کمالات کا علم ہوا تو فرمان بھیجا اور ابراہیم عادل شاہ کو بھی لکھا ۹۹۱ھ میں یہ فتح پور پہنچے۔ حکیم ابوالفتح اور عبدالرحیم خان خاناں استقبال کو بھیجے گئے بڑے اعزاز و احترام سے دربار میں آئے۔ صدارت کے منصب پر فائز ہوئے اور سال کے اندر اندر امین الملک عضد الدولہ خطاب ملا۔

وزیر اعظم مہاراجہ ٹوڈر مل کو حکم ہوا کہ تمام مہمات ان کی صوابدید اور مشورے سے انجام دیں۔ بہت سے معاملے مدت سے الجھے ہوئے پڑے تھے انھوں نے طے کر دئے۔

اسی سال تسخیر دکن کا ارادہ ہوا کل ممالک ہندوستان کی صدارت پائے نام ہوئی پانچہزار روپیہ گھوڑا خلعت انعام ملا اور خان اعظم کو کلتاش خاں کو ساتھ کر کے دکن کی فتح پر روانہ کئے گئے۔

اکبری دربار کے علماء جو اپنے وقت کے افلاطون تھے سب ان کے علم و فضل کے آگے کان پکڑتے تھے۔

ملا عبدالقادر بدایونی جن کی نظر میں کوئی عالم نہ سماتا تھا۔ شیخ عبداللہ اور ملا عبدالنبی ایسے لوگوں کے سر سے علم و فضل کی پگڑی جس نے سر دربار اتاری ان کے بحر علم کی گہرائی دیکھ کے دم بخود ہو گیا۔ چنانچہ اپنی مشہور تاریخ میں لکھتا ہے

دادئی الہیات و ریاضیات و کل اقسام عقلی و نقلی اور طلسمات و نیر نجات اور جر التعال میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ مذہب کا بڑا متعصب تھا عین دیوان خانے جہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز پڑھ سکے باطمینان تمام مذہب امامیہ کی نماز پڑھتا تھا۔ اس معاملے سے

چشم پوشی کرکے اس کے علم و حکمت اور تدبیر و مصلحت کی وجہ سے اس کی پرورش میں ایک دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اپنی سالی سے شادی کرکے اپنا ہم زلف بنالیا۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

اعلم علمائے زمان مدتوں حکام و اکابر فارس کا پیشوار ہا تمام علوم عقلی و نقلی حکمت ہیئت نجوم ہندسہ ۔ رمل ۔ حساب ۔ طلسمات ۔ نیر نجات ۔ جراثقال خوب جانتا تھا۔ اس میں وہ مرتبہ رکھتا تھا کہ اگر بادشاہ متوجہ ہوتے تو رسد باندھ سکتا تھا۔

ابوالفضل اکبرنامہ میں لکھتے ہیں:۔

میں سمجھتا تھا کہ عقل تعلیمی کا کاروان لٹ کر راستہ بند ہوگیا مگر اس بزرگ معنوی کو دیکھ کر رائے بدلی کہ اگر علوم عقلی کی پرانی کتابیں نابود ہو جائیں تو یہ سرے سے نئی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ اور جو کچھ ضائع ہوا اس کی پروا بھی نہ کریں اس علم و فضل کے ساتھ راستی و درستی و معاملہ فہمی میں بھی گوہر نایاب تھا۔

معتمد خاں اقبال نامہ لکھتے ہیں:۔

علمائے متاخرین میں میر فتح اللہ شیرازی کے برابر کوئی نہیں ہوا ۱۹۷ھ میں کشمیر میں انتقال ہوا بادشاہ کو خبر ہوئی تو فرمایا وہ ہمارے وکیل بھی تھے طبیب بھی تھے۔ اور منجم بھی ان کے انتقال کا جو صدمہ ہوا وہم جانتے ہیں۔ اس درد کا وزن کون کرسکتا ہے اگر وہ اہل فرنگ کے ہاتھ لگ جاتے اور وہ جوہر شناس ان کے عوض میں تمام خزائن سلطنت مانگتے تو ہم بڑی خوشی سے سودا کرلیتے اور سمجھتے کہ بہت نفع میں رہے اور جواہر بے بہا نہایت ارزاں خریدا۔

ان تمام قدر دانیوں کے باوجود میر کا صحیح مصرف نہ ہوسکا ورنہ آج سائنس کو ترقی دینے اور مشینوں کو ایجاد کرنے کا سہرا یورپ کے سر نہ ہوتا۔ ۹۹۵ھ کے مینا بازار میں انھوں نے اور امیروں کی دکان کے ساتھ اپنی دوکان بھی سجائی تھی جو انھیں کی ایجادات کا شوروم تھی اس کی خاص چیزیں یہ تھیں:۔

۱۔ بادآسیا:۔ ہوا سے چلنے والی چکی۔

۲۔ آئینہ حیرت:۔ اس میں عجیب و غریب تماشے نظر آتے تھے۔ دور سے کچھ اور نزدیک سے کچھ اور۔

۳۔ آلہ جراثقال:۔ بھاری چیزوں کو اٹھانے کی مشین جس میں پہیوں اور چکروں سے کام لیا گیا تھا۔

۴۔ نیرنجات:۔ کیمیاوی اجزار سے مختلف قسم کے تجربے۔

۵۔ قلعہ شکن توپ:۔ دیکھنے میں بہت بڑی اور پہاڑ پر چڑھانے کی ضرورت ہو تو حلقہ حلقہ الگ کرکے آسانی سے اوپر چلی جائے

۶۔ مشین گن:۔ ایک راونڈ میں بارہ فیر کرنے والی بندوق۔

یہی وہ جوہر علم و کمال تھا جس نے ہندوستان میں علوم عقلیہ کے دریا بہائے اور اس سے سیکڑوں نہریں نکل کے اطراف ملک میں پھیلیں ۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ماثر الکرام میں لکھتے ہیں:۔

حاشیہ محفل میر سے ایک جم غفیر نے استفادہ کیا اس عہد سے معقولات کا دوسرا ہی رواج ہوا

ص ۲۳۸

سید سلیمان ندوی آزاد بلگرامی کی تائید کرتے ہیں۔

میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانے میں معقولات کا دفتر لے کے ہندوستان وارد ہوئے۔
——— ہندوستان میں متاخرین علمائے ایران کی معقولی کتابوں کا رواج میر مذکور ہی کے ذریعہ پھیلا۔ حیات شبلی ص ۱۹

میر فتح اللہ شیرازی کے شاگردوں میں ملا عبدالسلام لاہوری نے بڑی شہرت حاصل کی اور ساٹھ سال تک درس و افادہ کی مسند بچھائے رہے۔

ملا عبدالسلام لاہوری کے شاگردوں میں جس نے مرجعیت حاصل کی وہ ان کے ہمنام ملا عبدالسلام لکھنؤ کے قریب دیوہ کے رہنے والے تھے ان کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق و مغرب میں ہوا۔ ان کے شاگرد پچھم میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب میں ملا دانیال چوراسی۔ شیخ محب اللہ اور شیخ واصف علی تھے۔ یہ تینوں بزرگ الہ آباد کے رہنے والے تھے۔

شیخ دانیال چوراسی اور قاضی گھاسی شاگرد شیخ محب اللہ سے ملا قطب الدین سہالوی نے تحصیل علم کی، یہی ملا قطب الدین علمائے فرنگی محل کے مورث اعلیٰ ہیں۔

اسی زمانے میں شیخ عبدالرحیم بجنوری اودھ کے صوبیدار ہوئے جن کا مقبرہ نادان محل کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے "پنج محلّا" "شیخن دروازہ" اور ایک شاندار قلعہ بنوایا جس کے ایک کمرہ میں چھتیس محرابیں اور ہر محراب پر دو مچھلیاں بنی تھیں جس کی وجہ سے وہ مچھی بھون کہا جاتا تھا۔

اکبر علم و فضل کا قدر دان تھا۔ لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی۔ اس نے علمائے اسلام کے ساتھ یہاں کے برہمنوں کو جو ہندوستان کی ہزاروں برس کی علم و تہذیب کا نچوڑ تھے۔ انعام و اکرام سے سرفراز کیا اور یہ خطہ ایران و ہندوستان کی طباعی و ذہانت ادبی سلیقہ اور علمی شعور کا سنگم بن گیا جس سے آخر میں سرشار و چکبست ایسے گوہر آبدار نکلے۔

اس وقت لکھنؤ میں ہندوؤں کے پرانے محلے باجپئی ٹولہ کناری ٹولہ۔ سوندھی ٹولہ اور اہیری ٹولہ چوک کے پاس تھے۔ آخر عہد اکبری میں اودھ کے صوبیدار جواہر خاں تھے ان کے زمانے میں محمود نگر، شاہ گنج آباد اور اکبری دروازہ تعمیر ہوا گھوڑوں کے ایک فرانسیسی تاجر نے چوک کے پاس چار عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ اسوقت لکھنؤ علوم کا مرکز ہونے کے ساتھ ایک بارونق شہر اور کمانوں کی صنعت میں مشہور تھا۔ جہانگیر نے یہاں ایک محلہ مرزا منڈی آباد کیا۔

گیارہویں صدی ہجری

شاہ جہاں کے عہد میں لکھنؤ کے صوبیدار سلطان علی قلی شاہ خاں تھے ان کے دونوں بیٹے فاضل اور منصور کے نام سے فاضل نگر اور منصور نگر آباد ہوا۔ اشرف علی خاں رسالدار نے اشرف آباد اور ان کے بھائی مشرف علی خاں نے مشرف آباد بسایا۔ مشرف آباد اب تولہ ہے۔ جس میں زیادہ ترکا یستھ ہیں۔ پیر خاں ایک فوجی افسر کے نام سے ایک محلہ پیر خاں کی گڑھی آباد ہوا۔

اس زمانے میں مولانا شیخ محمد آفاق۔ مولانا محمد رضا۔ میر محمد شفیع اور شیخ غلام نقشبندی لکھنؤ کے ان علماء میں تھے جن پر ہندوستان کو ناز تھا۔

یہ آپ سن چکے ہیں کہ لکھنؤ میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اکبر کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا اور یہاں ایسے علماء موجود تھے جنھوں نے مقامات حریری کے جواب میں مقامات لکھے تھے اس زمانے میں شیخ غلام نقشبند لکھنوی نے تفسیر قرآن اور لامعہ عرشیہ وحدت وجود ہیں اور شرح قصیدہ خزجیہ وغیرہ گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔
ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادے ملا نظام الدین جانشیں ہیں ملا علی قلی سے تکمیل کر کے لکھنؤ آئے اور یہیں سکونت اختیار کی ان کی درسگاہ میں علماء کا ایک جم غفیر تھا۔ اور معقولات میں ملا صدر الدین شیرازی کی مشہور کتاب شرح ہدایۃ الحکمت اور ملا محمود جونپوری کی شمس بازغہ پر حاشیہ لکھا اس کے علاوہ بہت سی کتابیں تصنیف کیں اورنگزیب نے ان کو فرانسیسی تاجر کی بنوائی ہوئی چار عمارتیں عنایت کیں جو بحق سرکار ضبط ہو چکی تھیں یہی فرنگی محل کہلاتی ہیں۔
ملا نظام الدین اور ان کی درس گاہ کو ایسا درجہ حاصل تھا جو ہندوستان میں کسی عالم اور کسی درس گاہ کو نصیب نہ تھا۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے:۔

"تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہ کر انھوں نے ایک عظیم شہرت اور اعتبار حاصل کیا ہے اس زمانے میں اطراف ہند کے اکثر علماء ان کی شاگردی پر نازاں ہیں اور جو شخص اپنی شاگردی کا سلسلہ ان تک پہنچاتا ہے وہ علماء میں ممتاز سمجھا جاتا ہے بہت سے لوگ دیکھے گئے کہ دوسری جگہ تحصیل علم کی اور مستند بننے کے لئے سند فراغ مولوی سے حاصل کی۔"

اس دور میں پورا خطۂ اودھ علم و فضل سے چھلک رہا تھا جس کا مرکز لکھنؤ تھا۔ آزاد بلگرامی نے اسکی کیفیت یہ بیان کی ہے۔

"سرزمین پورب قدیم الایام سے معدن علم و علماء ہے ——— اگرچہ تمام صوبجات ہندوستان حاملانِ علوم کے وجود کا فخر رکھتے ہیں۔ خصوصاً دار الخلافہ کہ جہاں ہر قسم کے صاحبان کمال نے مرجعیت کی وجہ سے علوم عقلی و نقلی کو پایہ بلند تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن صوبہ اودھ والہ آباد ایک خاص خصوصیت رکھتا ہے کہ کسی صوبے کو حاصل نہیں ہے اس واسطے کہ پورا صوبہ اودھ اکثر صوبہ الہ آباد تخمیناً پانچ کردہ زیادہ سے زیادہ دس کردہ (میل) آبادی شرفاء و نجباء ہے اور مدد معاش کے لئے سلاطین و حکام سے وظائف و زمین حاصل کی ہے۔ خانقاہیں و مدرسے بنائے ہیں اور مدرسان عصر نے ہر جگہ ابواب علوم اہل دانش کے لئے کھول دئے ہیں اور طلبہ علوم گردہ در گردہ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے اور جس جگہ کو موافق مزاج پاتے وہاں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ہر جگہ کے صاحبان توفیق طلبہ علم کی نگہداشت اور ان کی خدمت کو سعادت عظمیٰ جانتے ہیں۔

صاحبقران ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ کہتے تھے کہ پورب ہماری مملکت کا شیراز ہے ——— اور اس کتاب کی تحریر تک (سنہ ۱۱۵۲ھ) علم کا رواج خصوصاً معقولات کا جس طرح یہاں ہے قلمرو ہند میں کسی جگہ نہیں ہے

اسوقت بڑے بڑے علما جلوہ طراز اور مراتب کمال کی بلندیوں پر ممتاز ہیں۔"

مآثر الکرام ص ۲۲۱/۲

ظاہر ہے کہ شرفا اور نجبا کی یہ بستیاں ایکا ایکی نہیں قرنوں میں بسی ہوں گی اور یہ معاشرہ صدیوں میں قائم ہوا ہوگا شاہ جہاں اس دور سے نصف صدی پہلے اسے شیراز ہند کہہ چکا تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب شاہ جہاں نے اسے شیراز ہند کہا اسی وقت وہ شیراز نہیں بنا تھا بلکہ علوم کا سرمایہ صدیوں سے وہاں جمع ہو رہا تھا اسی بنا پر ۱۱۵۲ھ میں آزاد بلگرامی نے کہا ہے کہ "از قدیم الایام معدن علم و علما است"، یہ زمانہ اس کے علمی عروج کا زمانہ تھا اور پایۂ تخت میں بھی ایسے علما موجود نہ تھے خاص طور پر علوم عقلیہ کو جو ترقی یہاں ہوئی وہ ہندوستان میں کہیں نہ تھی ایک ایک چپہ علم کی روشنی سے چمک رہا تھا علوم عقلیہ کا وہ طوفان خیز دریا جو شیراز سے چلا تھا کشمیر اور لاہور ہوتا ہوا اودھ کے خطے میں پھیل گیا تھا۔

سلطنت اودھ کا قیام

علم کے اسی دور شباب میں یعنی ۱۱۳۶ھ میں سید محمد امین نیشاپوری اودھ کے صوبیدار ہوئے یہ تازہ وارد ایرانی اپنی اعلیٰ صلاحتوں سے بہت جلد شاہی منصب داروں میں داخل ہو کر ایک ممتاز درجہ پر پہنچ گئے۔ پہلے نواب سعادت خاں پھر برہان الملک بہادر جنگ خطاب ملا۔ اکبر آباد کے صوبہ دار اور شاہی توپ خانے کے انچارج ہو کر ایسی قوت پیدا کی کہ ہندوستان کی تمام طاقتوں کو شکست دے دی۔ کوڑہ کے زمیندار بلونت سنگھ کو بڑی بہادری سے زیر کیا۔ مرہٹوں کی زبردست فوج کو شکست دی اودھ کا صوبہ ایک مدت سے سرکش تھا۔ شیخ زادوں کی حکومت تھی جن کو اپنی شورہ پشتی پر ناز تھا۔ ان کے محل کے پھاٹک شیخن دروازہ میں ایک تلوار آویزاں تھی اور دہلی سے جو صوبیدار آتا اس تلوار کے سامنے سر جھکا کر سلام کرتا۔ برہان الملک ہاتھی پر سوار شیخن دروازے میں داخل ہوئے اور اس تلوار کو اپنی تلوار سے کاٹ کر گرا دیا۔ انھوں نے اپنی آمد ہی سے کچھ ایسے کڑے تیور ڈالے کہ کسی کو دم مارنے جرأت نہ ہوئی اور وہ پورے صوبہ پر قابض ہو گئے ان کی فوج نے چاروں طرف پھیل کے اپنے کیمپ لگا دیئے۔ مچھی بھون کے سامنے ایک نوبت خانہ بنوایا جس میں چھ وقت نوبت بجنے لگی اور لکھنؤ میں ایک نئی رونق اور چہل پہل پیدا ہو گئی۔

فوجی چھاؤنیوں میں لوگوں نے پختہ مکانات بنوائے اور ہر کیمپ اپنے افسر کے نام سے محلہ بن گیا۔ کٹرہ بیدحسن خاں۔ کٹرہ ابو تراب خاں۔ کٹرہ خدا یار خاں۔ کٹرہ بزن بیگ۔ کٹرہ وفا بیگ۔ کٹرہ محمد علی خاں۔ باغ مہانرائن سرائے معالی خاں۔ اسمٰعیل گنج (اب نہیں ہے) سب اسی زمانے میں آباد ہوئے۔ علما میں مولوی عبدالقادر اور ان کے بیٹے مولوی عصمت اللہ ہندوستان کے مشہور علما میں تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے علما درس و تدریس میں مشغول تھے۔

شاعری کے ذوق سے بھی اس زمانہ میں لکھنؤ بیگانہ نہ تھا۔ شاہ فصیح افصح ایک باکمال شاعر موجود تھے جو دہلی یا دکن سے متاثر نہ تھے بلکہ خود اپنے ذوق سے انھوں نے شعر کہنا شروع کیا تھا اس وقت میر و مرزا کوئی وجود میں نہ آئے تھے اور وہ ایسے شعر کہتے تھے کہ ان کے بہت بعد تک شعرائے دہلی کی زبان اتنی صاف نہ ہو سکی۔ ان کا دیوان ہندوستان کے اکثر کتب خانوں میں موجود ہے کچھ شعر ان کے تذکروں میں بھی ملتے ہیں جن سے زبان، حسن بیان معنوی بلندی اور شاعر کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

سرمہ چشم جہاں ہیں ہونا خاکساری کی کرامت دیکھی

اُردو شعراء کے مربی و سرپرست خاں آرزو دہلی سے اور مرزا عبدالعلی تحسین کشمیر سے لکھنؤ آئے۔

صفدر جنگ برہان الملک کے بعد ان کے بھانجے اور داماد مرزا مقیم ابو المنصور صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ ملا انھوں نے شہر سے تین میل پر جلال آباد میں قلعہ تعمیر کیا اور شیخ زادوں کو سات سو ایکڑ زمین دو گاؤں میں آباد ہونے کے لئے دی۔ جس سے شہر کی وسعت بڑھ گئی۔ مچھی بھون کی بھر سے درستی کی اور اس کے سامنے ایک پل کی بنیاد ڈالی۔

علماء میں ملا حمد اللہ اور ملا حسن نے شہرت حاصل کی اور معقولات میں ایسی ایسی کتابیں لکھیں جو آج تک منتہی طلبار کے درس میں داخل ہیں۔

ملا عبدالعلی بحر العلوم ملا محمد سعید۔ ملا محمد اسعد۔ ملا محمد رضا۔ ملا محب اللہ ملا عبدالعزیز اور ملا کمال الدین فرنگی محلی اور ان کے بیشمار شاگردوں سے لکھنؤ علوم عربیہ کا مرکز بن گیا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی درس گاہیں ملا نظام الدین سے بیشتر علمائے لکھنؤ کے سلسلہ کی موجود تھیں۔

صفدر جنگ علماء کے بڑے قدر دان تھے۔ ملا حمد اللہ کو انھوں نے اپنا دستار بدل بھائی بنایا اور ان سے برابر سے ملتے تھے۔ ملا محمد یعقوب فرنگی کو حکومت مفتی اعظم مقرر کیا۔

صاحب تاریخ علماء ہند کا بیان ہے کہ انھوں نے شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کو خط لکھا اور بہت چاہا کہ وہ لکھنؤ چلے آئیں مگر انھوں نے منظور نہیں کیا۔

شعرا میں زبردست خاں وفائی، مرزا ابو علی ہاتف۔ شیخ عبدالرضا تین ایران سے لکھنؤ آئے۔

شجاع الدولہ صفدر جنگ کے بعد شجاع الدولہ فرمانروائے اودھ ہوئے اور دس سال تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں جنگ آزمائی کرتے رہے۔ ۱۱۷۳ھ ہجری میں بکسر کی لڑائی ہار کے فیض آباد میں سکونت اختیار کی اور پوری آمدنی جنگی تیاریوں پر وقف کردی یہاں تک کہ اپنے رہنے کے لئے مکان تک نہیں بنوایا۔ چھپر میں سکونت تھی مگر توپوں اور بندوقوں کے ڈھالنے کے بڑے بڑے کارخانے تھے موشیر لاک (فرانسیسی جنرل) اور شمرو (جرمنی جنرل) اسکے نگراں تھے اور دو سو کاریگر صرف فرانسیسی تھے۔ جنھوں نے ایسی توپیں اور بندوقیں بنائیں کہ جلد بھرنے اور فیر کرنے میں انگریزی بندوقیں مات ہوگئیں۔ شکست کے بعد انگریزوں سے جتنے معاہدے ہوئے تھے ان میں سے ایک بھی پورا نہ کیا۔ نگران کی یہ تیاریاں دیکھ کے انگریزوں کو ان پر اصرار کرنے اور میدان میں اترنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اس زمانے میں اودھ کی حکومت قوت و طاقت، دولت و ثروت، اور علم و فن کی قدردانی میں مغل شہنشاہی کی صحیح معنوں میں جانشین تھی۔ اور دہلی ہی کی حکومت کا ایک ٹکڑا تھی۔ شجاع الدولہ دہلی کے تھے ان کی بیوی موتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں جنہیں محمد شاہ نے اپنی بیٹی بنایا تھا اور شجاع الدولہ سے خود ان کی شادی کی تھی۔ انھیں سے آصف الدولہ پیدا ہوئے ان کی شادی نواب خانجاناں کی بیٹی سے ہوئی یہ سب دہلی کی تہذیب و معاشرت میں پلے تھے۔ وہیں کی خو بوان میں سمائی ہوئی تھی۔ لکھنؤ حکمراں کی حیثیت سے آئے تھے۔ اس لئے دہلی والے ان سے اور یہ دہلی والوں سے مانوس تھے۔ جب ہندوستان کی جنگ جو قوموں نے دہلی کو تہ و بالا کرنا شروع کیا اور حکومت

رعایا کا جان و مال محفوظ نہ رکھ سکی تو لوگوں کو اودھ سے زیادہ قریب ۔ محفوظ ۔ دولت مند ۔ مانوس اور ان کا قدر دان کوئی خطہ نظر نہ آیا ۔ چنانچہ سب نے اُدھر کا رُخ کیا اور رات دن قافلے پر قافلے آنے لگے اور اسے اپنا وطن سمجھ کے آباد ہو گئے ۔ یہاں کے لوگوں نے بھی سر اور آنکھوں پر بٹھایا ۔ اتنی دلجوئی اور قدر دانی کی کہ وہ دہلی کے دکھ درد بھول کے بےفکری سے زندگی بسر کرنے لگے ۔

دہلی سے آنے والوں میں امراء ۔ علماء ۔ شعراء ۔ اطباء ۔ صناع ۔ سپاہی پیشہ ۔ ارباب نشاط اور عام شہری سب ہی طرح کے لوگ تھے ۔ ان کے آنے سے معاشرہ میں نئی زندگی پیدا ہو گئی ۔ شاعرانہ خوبیاں ادبی لطافتیں تہذیب و تمدن اہل لکھنؤ نے دہلی والوں سے سیکھا اور یہاں کے علم و فضل اور تقدس کا اثر یہ ہوا کہ امرد پرستی عیب قرار پا گئی اور دہلی والوں کو لکھنؤ آ کے اُسے چھوڑنا پڑا ۔ دولت کی افراط اور حسین و خوبرو ارباب نشاط کی کثرت نے عشق بازی عام کر دی ۔

آبادی کے لحاظ سے فیض آباد کی یہ حالت ہو گئی کہ شہر کے اندر جگہ نہ رہی باہر نکل کے لوگوں نے سکونت اختیار کی چہل پہل کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت گھوڑوں ۔ ہاتھیوں ۔ اونٹوں ۔ خچروں ۔ شکاری کتوں ۔ گایوں ۔ بھینسوں ۔ شکاری چیتوں اور شیروں کے چھکڑوں اور توپوں کے گذرنے کا تانتا بندھا رہتا تھا ۔

شہر کے اندر عالیشان عمارتیں اور سیرگاہیں اور باہر بڑے مرغزار اور شکار گاہیں بنائی گئیں ۔ جن کی اتنی شہرت ہوئی کہ شاہ عالم خود دیکھنے آئے ۔

چینی فرانسیسی ، انگریزی ، کابلی اور ایرانی تاجر قیمتی اور نفیس مال لئے ہر وقت موجود رہا کرتے تھے ۔

بڑی بڑی درس گاہیں قائم ہوئیں جن میں مشہور علماء درس دیتے تھے ان درس گاہوں کی اتنی شہرت ہوئی کہ کشمیر اور کابل سے طالب علم آتے تھے ۔

نظام حکومت کی چستی اور درستی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بائیس ہزار صرف مخبر اور ہرکارے تھے جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور ساتویں دن پونا اور کابل سے خبر لاتے تھے ۔

سپاہیانہ بانکپن عام اور فیض آبادی آن مشہور تھی ۔ شطرنج اور چوسر کا کھیل مرغ اور بٹیر کی لڑائی تفریحی مشاغل تھے بھنگ نوشی عام تھی ہر گھر میں بھنگ کا چبوترہ ہوتا تھا اور شہر میں بکثرت دوکانیں تھیں جن میں مختلف شکلوں میں بھنگ تیار ملتی تھی ۔

شیعہ سنی کی کوئی تفریق نہ تھی ۔ پیری مریدی ۔ عرس ۔ قوالی ۔ چادر ۔ شیخ دسدو کا بکرا ۔ میران جی کے گلگلے ۔۔۔ سید احمد کبیر کی گائے ۔ سید سالار کا جھنڈا ۔ مدار صاحب کی کندوری ۔ باباشکر گنج کا کونڈا ۔ بڑے پیر کی فاتحہ عام طور پر مروج تھی نماز روزہ نکاح طلاق دفن و کفن عموماً ایک طرح پر ہوتا تھا ۔

محرم میں جا بجا سبیلیں رکھی جاتی تھیں ۔ راستوں میں گھروں میں اور چبوتروں پر جو اسی غرض سے بنائے جاتے تھے تعزیے رکھے جاتے تھے شربت اور شیرینی پر نذر ہوتی تھی جو لوگ تعزیے نہیں رکھتے تھے وہ بھی شربت اور شیرینی تعزیوں پر لے جا کے چڑھاتے اور جو یہ بھی نہ کر سکتے وہ آنے دو آنے نقد تعزیوں پر چڑھاتے بعض پیسہ دو پیسے روپیہ دو روپیہ بھی چڑھاتے اس طرح تعزیہ ایک آمدنی کا ذریعہ بھی تھا ۔

خاص خاص جگہ تعزیوں کے سامنے پندرہ بیس شعر کا مرثیہ دو تین آدمی مل کے راگ سے پڑھتے زبان و بیان کے

لحاظ سے ٹوٹی پھوٹی شاعری اور بڑا شاعر مرثیہ گو تھا۔ جب سے فضلی نے روضۃ الشہداء کا ترجمہ کر دیا تھا اس وقت سے بعض جگہ وہ بھی پڑھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے تعزیے جلوس کے ساتھ اٹھائے جاتے تھے جن میں طبل تاشہ شہنائی۔ روشن چوکی بجتی اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بانک۔ اور پٹے کا فن دکھایا جاتا اور یا حسینؑ کے نعرے لگائے جاتے۔ شجاع الدولہ کو تعزیہ داری کی طرف توجہ نہ تھی۔

شعر و شاعری کا ذوق عام تھا امراء کے یہاں مشاعرے ہوتے تھے جن میں مرزا سودا۔ میر ضاحک۔ میر حسن، میر سوز۔ میر ضیاء ایسے استادانِ فن اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ شعراء کا جمگھٹا تھا۔ مرزا امامی۔ میر علی اعلیٰ، قانع، میر کلو داماد خواجہ میر درد، نظر علی گمان، شاہ واقف، میر شمس الدین فقیر۔ مصنف حدائق البلاغہ، مظہر علی راز گدا علی بیگ بسمل، لگھاسی رام خوشدل، کشن چند مجروح، میر ولایت اللہ ولایت، محمد علی خاں مرزائی، میر غلام حیدر مجذوب، مرزا احسن علی احسن، میر محمد تبر، محمد پناہ نثار، مرزا اسمٰعیل طپش، میر شیر علی افسوس، میر ولایت وحشت، علی نقی کافر، میر حفیظ اللہ حفیظ، میکو بیگ درخشاں، میر شاہ علی خاں وغیرہ دہلی سے آئے اور محمد صدیق مخموری، شیخ نظام الدین احمد صانع بلگرام سے لالہ ٹیکا رام ظفر اور مرزا علی نقی محشر کشمیر سے شاہ فتح محمد دل اکبر آباد سے میر صدر الدین صدر مرزا ابوالحسن موالی ایران سے لکھنؤ آئے۔

فیض آباد اور لکھنؤ میں جو شعراء پیدا ہوئے ان کے نام بھی سن لیجئے۔

نور خاں آگاہ، محمد اعظم اعظم، بقاء اللہ خاں بقا۔ جان عالم خاں خان۔ نواب محمد تقی ہوس۔ نواب محمد تقی ترقی حسن علی حسن۔ خواجہ حسن حسن۔ بندرابن راقم، مہربان خاں رند، نواب احمد علی سوزاں، میر فخر الدین فخر، میر جیون قربان، شیخ لطف اللہ کامل، میر حسن مشتاق۔ میر نبی جان مدہوش، موہن لال انیس، جسونت سنگھ پروانہ مرزا محمد بہار، میر برہان علی ذہین، مرزا عبد اللہ رافت۔ مرزا جعفر رومی، مرتضیٰ قلی بیگ شہید۔ ابراہیم بیگ شرار، نثار علی قرین، کنور سین مضطر۔

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

ماجد و لین نمبر

فرانسیسی ادب کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دلدوز تاریخی رومان جس کی نظیر کسی زبان کے ادب میں آپ کو نظر نہ آئے گی۔

★ اسے پہاڑوں نے سنا اور کانپ اٹھے ★ زمین نے سنا اور تھرا اٹھی ★ خدا نے سنا اور تادیر ملول رہا ★ اور جسے روح سنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کر نئی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے۔

محبت کا خراج صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے امڈتے اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں اور ممکن نہیں کہ یہ سانحہ پڑھ کر آپ یہ خراج ادا کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔　　قیمت ۳ روپے

نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

چالیس ۴۰ کی اہمیت

اقوامِ عالم میں کیوں ہے ؟

(نیاز فتحپوری)

دنیا میں کوئی قوم یا مذہب ایسا نہیں جس میں چالیس (۴۰) کے عدد کو خاص اہمیت حاصل نہ ہو۔ مثلاً مرنے کے بعد چہلم (چالیسواں) کی رسم، ریاضت و عبادت میں چلّہ کشی یعنی چالیس دن کا اعتکاف، سورۂ احقاف میں اربعین (۴۰ سال) کو پختگی عمر کا زمانہ ظاہر کرنا، زمانۂ نفاس (زچگی) کی مدّت عورت کے لئے چالیس دن کی متعین کرنا۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن سے ہر مسلمان گھرانا واقف ہے ـــــ اسی طرح یہودیوں کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عدد ان کے یہاں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے بنی اسرائیل ۴۰ سال تک خانماں برباد بھرا کئے۔ ایلیا نبی کو ۴۰ دن تک کوؤں نے غذا پہنچائی۔ طوفان نوح بھی چالیس دن تک قائم رہا۔ اور مصر قدیم میں بھی لاش کی مومیائی کے لئے ۴۰ دن مقرّر تھے۔

انگلستان کے عہد وسطیٰ میں قتل انسان کے جرمانہ کی ادائی کے چالیس دن مقرّر تھے۔ جنگ کے دوران فریقین کو آرام لینے کے لئے بھی چالیس دن کا وقفہ ملتا تھا۔ دار العوام کے التوا کے بعد ممبران پارلیمنٹ کو جو مہلت ملتی تھی وہ بھی چالیس دن کی ہوتی تھی۔

چالیس کی اہمیت مسلمانوں اور یہودیوں کی طرح زردشتیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلے توریت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ـــــ طوفان نوح ۴۰ دن تک قائم رہا اس کے بعد پہاڑ کی چوٹی نظر آئی ـــــ یعقوب کی لاش کو حنوط کرنے کے لئے ۴۰ دن درکار ہوئے۔ موسیٰ ۴۰ دن تک پہاڑوں میں بھوکے پیاسے پھرتے رہے۔ چالیس چالیس دن کے روزے انھوں نے رکھے، ایلیا چالیس دن تک بے آب و دانہ رہے۔ یہوداکے ۴۰ سالہ گناہ کی یاد میں، ایلیا ۴۰ دن تک داہنی کروٹ سے لیٹے رہے۔ گولیتھ نے اسرائیلی فوجوں کا ۴۰ دن مقابلہ کیا ـــــ اہل نینوا کو توبہ کے لئے ۴۰ دن کی مہلت دی گئی۔ بنی اسرائیل ۴۰ دن تک جنگلوں میں پھرتے رہے، اہل فلسطین نے ۴۰ سال تک بنی اسرائیل کو پریشان رکھا ـــــ سلیمانؑ، داؤدؑ، یوشعؑ نے ۴۰ سال تک حکومت کی ـــــ زردشت نے ۴۰ سال کے بعد تبلیغ شروع کی۔ پارسیوں میں ۴۰ دن تک مسلسل اہورامزدا کے اسماء کا ورد کیا جاتا ہے۔ سال کے ۳۶۰ ایام کو ۹ چلوں میں تقسیم کرتے ہیں اور مذہبی رہنما بننے کے لئے بھی ۴۰ دن کی ریاضت ضروری ہے۔

ہندوؤں کے یہاں عورت کے ایام زچگی ۴۰ دن مقرر ہیں۔ بچّے کی ناف کاٹ کر ۴۰ دن تک اسے ماں کے سرہانے رکھتے ہیں۔ ویدک طریق علاج میں کایا پلٹ کے لئے ۴۰ دن درکار ہوتے ہیں ـــــ عیسوی روایات میں بھی ۴۰ کا ذکر بکثرت پایا جاتا

ہے۔ مسیح کی ولادت کے ۴۰ دن بعد حضرت مریم نے مسیح کو معبد میں پیش کیا۔ مسیح نے چالیس دن کا روزہ رکھا۔ مصلوب ہونے کے بعد ۴۰ گھنٹے مقید رہے۔ احیاء ثانی نے ۴۰ دن بعد آسمان پر لے جائے گئے۔ الغرض تمام اقوام عالم میں ۴۰ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن کیوں ؟۔

یہ سوال سب سے پہلے ۶۰ سال قبل "ام۔ اس۔ بیدورڈس" نے انجمن علم الانسان کے سامنے پیش کیا اور لوگوں کو اس کی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ انھیں میں ایک شخص مسٹر پربھو تھا جس نے اس معمہ کو بڑی حد تک حل کر لیا۔

ان تمام روایات سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ کسی زمانے میں پوری جماعت انسانی اکٹھا ایک ہی حصۂ زمین میں مقیم تھی اور اس کے تمام افراد ایک ہی سی ذہنیت رکھتے تھے اور ان کے تاثرات بھی یکساں تھے۔ بعد میں جب وہ منتشر ہو کر مشرق و مغرب میں پھیل گئے تو اپنی بعض روایات کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اس لئے اب اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعت انسانی کے افراد کب اور کس حصۂ زمین سے اِدھر اُدھر منتقل ہوئے اور ۴۰ کے عدد کو ان کی روایتی زندگی میں کیوں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ وہ اسے نہیں بھولے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے کرۂ زمین کے کس حصہ میں رونما ہوا۔ اس کے متعلق ماہرین علم الانسان نے مختلف نظریے قائم کئے اور غلط ثابت ہوئے۔ آخر کار متفقہ طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ عہد قبل تاریخ میں انسان کا سب سے پہلا مسکن وہ حصۂ زمین ہے جسے قطب کا منطقۂ بارد کہتے ہیں ہر چند یہ نظریہ بہت عجیب سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ برف سے ڈھکے ہوئے منجمد علاقے میں کسی کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ لیکن علماء طبقات الارض کی جدید تحقیقات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اس منطقہ کا برفانی یا انجمادی دور کوئی مستقل چیز نہ تھا۔ معلوم نہیں کتنی بار یہ دور آیا اور گزر گیا۔ لیکن اس کا آخری برفانی دور مسیح سے ۴۰ ہزار اور ۲۰ ہزار سال کے درمیان پایا جاتا تھا۔ لیکن اس عہد میں بھی صدیاں ایسی گزر جاتی تھیں کہ موسم گرم ہو جاتا تھا اور یہ منطقہ آبادی کا اہل بن جاتا تھا۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا ثبوت اس منطقہ کے گرم ہو جانے کا یہ بھی ہے کہ وہاں ہے اور کوئلے کی بڑی زبردست معدنیں حال ہی میں دریافت ہوئی ہیں۔ بہر حال یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ منطقۂ بارد ہمیشہ برفانی نہیں رہا ہے اور اس پر گرمی کے دور بارہا گزر چکے ہیں۔ یہیں سب سے پہلے انسانی آبادی کا آغاز ہوا اور بعد میں برفانی دور آنے کی وجہ سے وہ ادھر اُدھر منتقل ہوتی رہی۔ لیکن ۴۰ کے عدد سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اس کی داستان اور زیادہ دلچسپ ہے۔

اس سے غالباً ہر شخص واقف ہے کہ آفتاب کے طلوع و غروب کی جو صورت گرم ممالک میں پائی جاتی ہے۔ وہ منطقۂ بارد سے بالکل مختلف ہے ۸۰؁ خط عرض البلد پر (جو قطب شمالی کے نیچے سے گزرتا ہے) شب و روز کے ظہور کی کیفیت گردش زمین کی بناء پر یہ ہے کہ وہاں ۴۰ دن تو بالکل تاریکی رہتی ہے۔ اس کے بعد ۲۴ دن تک صبح صادق کی سی کیفیت رہتی ہے پچیسویں دن آفتاب کا ایک گوشہ نظر آتا ہے اور چند منٹ بعد غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پندرہ دن تک آفتاب تدریجاً زیادہ بلند ہو ہو کر غائب ہوتا رہتا ہے اور سولہویں دن پورے ۲۴ گھنٹوں تک نمودار رہتا ہے۔ اس کے بعد روشنی کا وقفہ کم ہوتے ہوتے سولہویں دن پھر تاریکی ہو جاتی ہے لیکن جب آفتاب ایک بار پوری طرح نکل آتا ہے تو پھر تقریباً چھ مہینے تک غروب نہیں ہوتا اور سروں پر چکر لگایا کرتا ہے۔ اس چھ ماہ کے طویل عرصہ کے بعد ۲۴ دن ایسے گزرتے ہیں جیسے شفق پھولی ہو اور پھر ۲۴ دن باری باری طلوع آفتاب اور طلوع شفق کے گزرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ آفتاب بالکل غائب ہو جاتا ہے اور ۴۰ دن کی طویل رات شروع ہو جاتی ہے ــــــ ظاہر ہے کہ جس حصہ زمین میں رات اتنی طویل ہوتی ہو وہاں طلوعِ آفتاب

کا انتظار کس بے صبری کے ساتھ کیا جاتا ہوگا اور کیا کیا خوشیاں رات کے ختم ہونے پر نہ منائی جاتی ہوں گی۔

جنھوں نے قدیم اقوام کی تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان سب میں آفتاب پرستی کا رواج تھا۔ اڈونس، اتیس، تموز، مردوک اور اندر سب سورج دیوتا ہی کے مختلف نام تھے۔ قدیم یونان و روما میں اتیس کا احیاء ثانی یا ظہور ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا تھا۔ یہی تاریخ بعد میں عیسائیوں نے مسیح کے دوبارہ جنم لینے کی اختیار کی۔

اب اس پچیس کا راز بھی سن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ قطب کے منطقہ میں (جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں) آفتاب پچیسویں دن پوری طرح طلوع ہوتا ہے اور اس دن کی خوشی میں قدیم اقوام نوروز منایا کرتی تھیں۔

اب رہا سوال ۴۰ کی اہمیت کا سو اس کا حساب یہ بیٹھتا ہے کہ آفتاب اپنے اولین طلوع کے بعد سولہ دن تو وہ یونہی عارضی طور پر نکلتا چھپتا رہتا تھا لیکن جب یہ زمانہ ختم ہو جاتا تھا تو اس کے پورے ۲۴ دن کے بعد وہ حقیقی دن شروع ہوتا تھا جو ۶۵ دنوں تک قائم رہتا تھا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ (۱۶ + ۲۴) یعنی پورے چالیس دن کے انتظار کے بعد ان کا یوم عید شروع ہوتا تھا اور اس طرح سب سے پہلے قطب کے منطقۂ بارد میں چالیس دن کی اہمیت شروع ہوئی اور جب بعد میں یہاں کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچی تو وہ اس روایت کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔

چونکہ حقیقی دن کے طلوع کے لئے انتظار کے پورے ۴۰ دن بڑی دشواری سے بسر ہوتے تھے اور یہ زمانہ غیر معمولی طویل محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے بعد میں ہر صعب و طویل زمانہ کے لئے چالیس دن کی اصطلاح قائم ہو گئی۔

مومن نمبر

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

مرتبہ:- نیاز فتحپوری

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخ حرم بھی ہے اور رند شاہد باز بھی۔ اسلئے اسکی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے۔ یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہل ذوق کے لئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ مومن نمبر کے مطالعہ سے ہوگا۔

اس نمبر میں مومن کی سوانح حیات، معاشقہ، غزلگوئی، قصیدہ نگاری، مثنویات و رباعیات اور خصوصیات کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔

قیمت:- چار روپے

نگار پاکستان - ۳۲ - گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

مانی

پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

مانی کا باپ خالص فارسی نژاد تھا - اپنے وطن ہمدان سے ہجرت کر کے بابل میں جا بسا - ۲۱۶ء میں مانی یہیں پیدا ہوا اور یہیں پرورش اور تعلیم پائی - وہ ایک شامی مسیحی راہب ہولیینز (یا بروایت البیرونی فادرون) کا شاگرد تھا - یہ وہ زمانہ تھا کہ دین زرتشتی کے علاوہ مشرق میں بودھ مت کا ڈنکا بج رہا تھا جس کی گونج سرزمین زرتشت تک پہنچ رہی تھی اور مغرب میں مسیحیت کا غلغلہ بلند تھا - مانی نے ان تین مذاہب کے علاوہ بابلی عقائد مذہبی کا اثر براہ راست جذب کیا - اس کی تعلیمات میں یہ سارے اثرات نمایاں ہیں - مگر ان تمام ادیان میں عیسائی اور زرتشتی عناصر سب پر غالب ہیں - اس نے ان دونوں میں باہمی تطابق کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی اور مجوس دونوں اس کے دشمن ہو گئے، اور اس کا مذہب ابتدائے ظہور سے مشرق و مغرب میں مجوسیوں اور مسیحیوں کے ہاتھوں شدید ترین مصائب کا نشانہ بنا رہا - مگر عام سیاسی و مذہبی سنت کے موافق ان مظالم و شدائد ہی نے اسے زیادہ فروغ دیا اور اس کی عمر بڑھا دی - صدیوں تک لوگ اس دین میں داخل ہوتے رہے اور ایشیا و یورپ کے مذاہب پر اپنا عظیم الشان اثر چھوڑے بغیر نہ مٹا - چوتھی صدی عیسوی کے آخر تک عیسائیوں کے ناسٹک فرقہ کے عقائد میں یزداں و اہرمن بھی شامل تھے - ان کا عقیدہ تھا کہ مسیح روح محض ہے جو فرشتوں سے بھی افضل ہے - اس روح کا پہلے آدم میں نزول ہوا - پھر نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ وغیرہم میں اور آخر میں حضرت عیسیٰؑ میں جلوہ گر ہوئی اور پھر مصلوب ہو کر آسمان پر چلی گئی[1]

اپنے دین کے لئے مناسب سرزمین کی تلاش میں وہ ایران پہنچا - اردشیر کا زمانہ تھا - اس نے اسے قبول کر لیا مگر اس کا بیٹا شاپور اس کا معتقد نہ ہوا - مانی نے تبلیغ و ارشاد کی غرض سے اس کے لئے ایک کتاب شابرقان (شاپورکان) لکھی تھی مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی - شاپور نے اسے اپنی قلمرو سے خارج کر دیا تو وہ ہندوستان، چین اور تبت جا کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا رہا - ہرمز نے بھی اس کے بہت سے پیروؤں کو قتل کیا - ہرمز کے بیٹے بہرام کے عہد میں ۲۷۳ء کے قریب مانی دو سال کی جلا وطنی و روپوشی کے بعد فارس میں واپس بلایا گیا تو بہرام نے زرتشتی علما کو جمع کر کے اس سے مناظرہ کرایا - جس میں مانی کو شکست ہوئی - آخر بہرام نے اسے قتل کر کے اس کی کھال میں بھس بھروا دی اور چند شاپور کے

---

[1] تاریخ صحف سماوی از پروفیسر سید نواب علی ص ۱۱۱ " نور محمدی کی ازلیت کا عقیدہ مسلمانوں میں انھیں منذیقوں سے ماخوذ ہے اسی طرح حضرت علیؓ کی بقا و رجعت بھی "۔

دروازے پر لٹکوا دیا۔[۱] بقول البیرونی اب تک اسی مناسبت سے اس دروازے کو باب مانی کہتے ہیں۔

بقول علامہ ابن خرم شہرستانی موبذ موبذاں جس نے شاہ بہرام کے سامنے مانی سے مناظرہ کیا اس کا نام آذر باذبن مار کسفند تھا۔ اس نے مانی سے کہا "تمہارا کہنا ہے کہ نکاح حرام ہے تاکہ عالم جلد فنا ہو جائے اور ہر شکل اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے کیونکہ نسل انسانی میں نور و ظلمت کا امتزاج ہے۔ اس لئے قطع کر کے نور کو ظلمت سے رہائی دلانا واجب ہے۔ اگر ایسا ہے تو سب سے پہلے تمہیں کو اس سے رہائی دلانا چاہئے اور اس امتزاج سے نجات دلانے میں تمہاری مدد کرنا چاہئے۔" مانی لاجواب ہوگیا۔ اور بہرام نے اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا اور اس کے ساتھ کی جماعت بھی قتل کر دی گئی۔[۲]

پروفیسر موسیو اسپرنگ لینگ M. SPRENGLING کے مقالہ مانی مطبوعہ پاکستانی کوارٹرلی جلد ۵ شمارہ ۲ ۱۹۵۵ء کے بیان کے مطابق مانی کے دوران سیاحت میں شاہ بہرام نے اسے دربار میں بلا بھیجا۔ اس پر جرم یہ عائد کیا گیا کہ اس کی تبلیغ دین فرولستی (زرتشتی) کے لئے نقصان رساں ہے اور رعایا کو اپنے دین سے برگشتہ کرتی ہے۔ مانی اپنے تین چیلوں اور ایک ترجمان یا وکیل کے ہمراہ حاضر ہوتا ہے۔ ہرمز (زرتشتی پیشوایان دین) اس سے سوال کرتے ہیں۔

"تم شکار اور حرب و ضرب کی کیوں مخالفت کرتے ہو؟ تم قوم کو اس کے آبائی دین مزدہی سے کیوں منحرف کرتے ہو، حاضری دربار کے حکم کی فوراً تعمیل کیوں نہیں کی؟ دربار کے ایک بیمار کے علاج سے کیوں اعتراض کیا (مانی طبیب بھی تھا) یہ الہام و وحی جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کسی اور پر، کسی بادشاہ یا اس کے پجاریوں اور مذہبی پیشواؤں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل ہوئی؟"

مانی نے اگلے بادشاہوں، شاپور اور ہرمز و اردشیر کی نظر عنایت کا حوالہ دیا اور اپنی معصومیت پر سورج کی شہادت پیش کی مگر کوئی عذر شافی نہ سمجھا گیا۔ وہ ۲۶ روز بھاری زنجیروں میں جکڑ کر عذاب میں رکھا گیا اور بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔

پروفیسر موصوف کا بیان مبالغہ اور توڑ مروڑ سے خالی نہیں۔ پھر بھی اس سے اور مانی کی تعلیمات سے جن کی تصریح آگے آتی ہے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مانی کی تبلیغ رہبانیت و نفس کشی قوم کی ملّی زندگی و ترقی کے لئے خطرناک سمجھی گئی ہوگی اس لئے دانشوران حکومت عام سنت حکمرانی کے مطابق جس سے کوئی زمانہ کوئی قوم کوئی دین خالی نہیں اس کا استیصال ضروری سمجھا ہو۔

پروفیسر موصوف نے مانی کے زندہ کھال کھینچے جانے اور اس میں بھُس بھروا کر لاش کے ہنڈوائے جانے کی تردید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غالباً صرف اس کا سر تشہیر کے لئے کاٹ لیا گیا تھا اور باقی اعضا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کوڑوں کے ڈھیر پر ڈال دیا گیا تھا، جن کو اس کے معتقدین اٹھائے گئے اور کچھ عرصہ تک فارس میں رکھ کر ان کو پایۂ تخت مدائن میں دفن کر دیا۔ گو وہ کوئی تاریخی شہادت پیش نہیں کرتے، ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔

اس مقالے میں پروفیسر موصوف نے مانی کے وطن، ولدیت، تلمذ، تعلیم و تربیت، سیاحت و سیرت پر سیر حاصل

---

۱ سنی ملوک الارض لحمزہ اصفہانی ص ۳۵

۲ الملل والنحل جلد اول۔ تحت فلسفۂ مانی۔

بحث کی ہے مگر معتقدات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ مجملاً اس کی قابلیت ایثار وجد وجہد سے ہمدردی و تحسین کا اظہار کیا ہے جو مغربی مستشرقین کی عام روش ہے۔

البیرونی کا بیان ہے کہ اردشیر اور اس کے بیٹے شاپور اور اس کے بیٹے ہرمز کے عہد تک موانع و شدائد کے باوجود مانوی مذہب بتدریج بڑھتا ہی رہا۔ اردشیر تو اس کا معتقد ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بعد سارے بادشاہ اسکے پیرؤں کے درپے رہے ہے۔ ابن الندیم کے بیان کے مطابق بہرام کے ظلم وستم کے بعد یہ لوگ ماوراء النہر میں جا بسے۔ یہاں تک کہ جب فارسیوں کے زوال اور عربوں کے عروج کا زمانہ آیا اور خلفائے بنی امیہ ایران پر متسلط تھے تو وہ عراق اور ایشیائے کوچک وغیرہ میں واپس آئے ۔ .... المقتدر (عباسی) کے زمانہ سنہ ۹۰۸ تا ۹۳۲ء پھر انھیں اپنی جانیں لے کر خراسان میں پناہ لینا پڑی۔ خراسان کے گورنر نے جزیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا اور کوئی تعرض نہ کیا۔ اس طرح ممالک اسلامیہ میں ان کی بلا کم ہوتی گئی۔ تاہم معزالدولہ کے زمانے سنہ ۹۴۶ تا ۹۶۷ء میں تین سو مانویوں کو جانتا تھا مگر آج کل بغداد میں پانچ مانوی بھی موجود نہیں ؏

ابن الندیم نے بہت سے لوگوں کے نام گنائے ہیں جو بظاہر مسلمان اور بباطن مانوی سمجھے جاتے تھے۔ ان میں جعد بن درہم جو اموی خلیفہ ہشام سنہ ۷۲۴ تا ۷۴۳ء کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

بشار بن برد (شاعر) جو سنہ ۷۸۴ء میں قتل کیا گیا۔ تمام آل برمک باستثنائے محمد بن خالد برمکی، خلیفہ المامون (جسے خود صاحب الفہرست باور نہیں کرتا) محمد بن الزیات (وزیر المعتصم) جو سنہ ۸۴۷ء میں مارا گیا۔ اور بہترے لوگ داخل ہیں لے

اصطلاح زندیق

ہارون رشید کے باپ المہدی عباسی نے عارفوا الزنادقہ کے نام سے ایک تحقیقاتی کمیشن اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ ایسے لوگوں کا پتہ لگا کر سزا دے جو اسلام کے ظاہری لباس میں مانوی یا زندیقی عقائد کے قائل تھے۔ زندیق کے معنی عام طور پر لئے گئے ہیں "پیرو ژند" یا وہ شخص جو اصل صحیفے کے مقابلے میں روایتی تاویلات کو اختیار کرے۔ مگر البیرونی کے بیان کے مطابق دین مانوی کے مقتداؤں کے مختلف طبقات میں سے جو طبقہ مال و دولت پر مسکینی و مفلسی کو اختیار کرتا شہوات نفسانی کو مارتا۔ دنیا کو ترک کرتا یا درویشانہ زندگی بسر کرتا۔ یا ہمیشہ روزے رکھتا اور صدقے دیا کرتا اس کو صدیق کے لقب سے خطاب کرتے تھے۔ جو ارامی زبان میں صدیق تھا۔ پہلوی میں

لہ تعجب ہے کہ مولانا شرر کے مجموعہ مضامین صد پارۂ دل میں مانی پر جو مضمون ہے اس میں شاپور اور ہرمز کو مانی کا قدردان و حامی بتایا ہے اور یہ کہ "ہرمز ہی نے علاقہ بابل میں ایک قلعہ اُسے رہنے کو دے رکھا تھا کہ اپنے دین کی اشاعت و تبلیغ کرے۔ آخر بہرام بن ہرمز نے موبدوں کے اغواء سے اس کو اس قلعہ سے پکڑ وا منگایا اور ہلاک کیا" معلوم نہیں مولانا نے کن ماخذوں کی بنا پر یہ باتیں لکھی ہیں۔ افسوس ہے کہ تاریخی حوالوں کے بغیر اس قسم کے تاریخی مضامین کی قدر و قیمت جتنی چاہیے باقی نہیں رہتی۔ مانی کے متعلق ہمارے پاس سب سے قدیم اور مستند ماخذ البیرونی متوفی سنہ ۴۴۰ھ کی کتاب آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ۔ (البیرونی نے مانی کی کئی کتابیں پڑھی بھی تھیں)۔ ابن الندیم متوفی سنہ ۳۸۵ھ کی الفہرست اور حمزہ اصفہانی کی کتاب سنی ملوک الارض والانبیاء مولفہ سنہ ۳۵۰ھ اور زیادہ تر انھیں سے میں نے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے) ان کے بیانات مولانا شرر کے مذکورہ بیانات سے بالکل متناقض ہیں۔ حواشی میں سارے حوالے مع نشان صفحات مندرج ہیں شائقین تحقیق ان کو آسانی سے جانچ سکتے ہیں۔

لہ الفہرست مطبوعہ لیپزک ص ۳۰۰ تا ۳۳۵

زندیک، عربی میں زندیق ہوگیا۔ ابتداء میں اس کا اطلاق صرف مانویوں کے لئے مخصوص تھا مگر بعد میں ہر ملحد و مبتدع کو اسی لفظ سے تعبیر کرنے لگے۔ چنانچہ البیرونی مختلف طبقات صدیقین و سماعین کے ذکر میں کہتا ہے۔ شرع نوامیس یعتم حنھا الصدیقون (وھم ابرار المانویۃ وزھادھم) علی انفسھم من ایثار المسکنۃ والشھوۃ ورفض الدنیا والزھد فیھا ومواصلۃ الصوم والتصدق بما امکن وتحریم اقتناء شیٔ خلا قوت یوم واحد ولباس سنۃ وترک السفاد وادامۃ الطواف فی الدنیا للدعوۃ والارشاد۔ یعنی صدیقوں پر جن سے مانویوں کے ابرار و زہاد مراد ہیں۔ مانی نے یہ قوانین فرض کر دئے کہ مسکینی اختیار کریں۔ حرص و شہوت کو اکھاڑ پھینکیں۔ دنیا کو ترک کرکے پرہیزگار بن جائیں، لگاتار روزے رکھیں اور جہاں تک ہو سکے صدقے دیں، ایک دن کی خوراک اور ایک سال کے لباس سے زیادہ حاصل کرنے کو حرام سمجھیں۔ مجامعت ترک کر دیں۔ تبلیغ و اشاعت دین کے لئے ساری دنیا میں پھرا کریں۔

البیرونی نے مانی کی تصانیف کثیرہ میں سے اس کی انجیل شاپورکان۔ کنزالاحیاء، سفرالجبابرہ (کتاب دیوان) اور سفرالاسفار کے نام بتائے ہیں۔ جن میں مانی نے دعوی کیا ہے کہ حضرت مسیح نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے میں نے ان کی تصریح کی ہے[1]

مانی کا فلسفہ

دین مانی کا اور ادیان سے استفادہ و اقتباس، مسیحی عقیدۂ کفارہ کی توسیع، دنیا کے اصلاً ارشر ہونے کی تعلیم، اور اس طرح عقیدۂ رہبانیت و درویشی کا عقلی استحکام، ان سب باتوں نے مل ملا کر اس مذہب کو ایسی طاقت بخش دی جس نے مشرقی و مغربی مسیحیوں ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ایران میں فلسفیانہ خیالات کے ارتقا کا دھندلا سا نشان بھی چھوڑ گئی۔

مانی نے زرتشت کے جنگ نور و ظلمت کے عقیدے کی بنیاد پر ایک بڑی عمارت کھڑی کی۔ وہ دنیا کی اصل کو شر یا ظلمت قرار دیتا اور نور و ظلمت کو مختلف اوصاف سے متصف کرتا ہے۔ چنانچہ نور سے وہ دس صفات کو مستخرج بتاتا ہے مروت، علم، فہم، غیب، ذہن، محبت، ایمان، دین، احسان، حکمت۔ اسی طرح ظلمت کو پانچ صفات اولیہ کا مظہر بتاتا ہے۔ دھندھلکا، تاریکی، گرمی، آگ، زہر۔ انھیں اصول کے ساتھ وہ فضل عالم کی قدامت بھی ثابت کرتا ہے۔

اول اول قدرت کے ان دونوں والدین (نور و ظلمت) میں سے وہ ظلمت کو بجائے ماں کے قرار دیتا ہے جس کے پیٹ میں عناصر پوشیدہ تھے۔ مدتوں جمع ہوتے رہے اور مہیب شیطان کی صورت میں متولد ہوئے۔ مادر ظلمت کے اس اکلوتے بیٹے نے شاہ نور پر[2] حملہ کیا۔ اس نے اس کے حملے سے بچنے کے لئے آدم اول کو پیدا کیا۔ اب ولدالنور (انسان اول) اور ولدالظلمۃ (شیطان) میں سخت جنگ شروع ہوئی۔ انسان اول کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ شیطان نے اپنے پانچ عناصر ظلمت کے ساتھ نور کے پانچ عناصر بھی ملحق کر لئے۔ اس پر نور نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ ان مخلوط عناصر سے دنیا بنائے تاکہ وہ نور کے ذرات کو ظلمت کی قید سے آزاد کر دے ــــ یہ ذرات نور ظلمات ــــ محیط کے ذرات ــــ سے آزاد ہو کر سورج اور چاند تک پہنچتے رہتے ہیں اور وہاں سے فرشتے انھیں نور مجرد تک پہنچا دیتے ہیں جو پیدر وزرگی (پدر بزرگی) اور

---

[1] آثار الباقیہ ص ۲۰۸

[2] ایک جلیل القدر صوفی کے اس شعر میں یہ عقیدہ صاف جھلک رہا ہے۔

ما پر تو نور پادشاہ از لیم ۔۔۔ فرزند نہ ایم آدم و حوا را

بادشاہ بہشت کا مسکن ہے [۱]

مانی کے عقائد فلسفیانہ نقطۂ نظر سے خواہ کیسے ہی ناچیز سمجھے جائیں، بہرحال ایک امر متیقن ہے۔ وہ یہ کہ مانی پہلا شخص ہے جس نے دنیا کو شیطان کی حرکت کا نتیجہ اور اس لئے اسے بالطبع زشت بتایا ہے۔ اور ترک دنیا و عزلت گزینی کا اصل اصول یہی عقیدہ ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی مشہور جرمن فیلسوف شوپنہاور بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہے۔

عقائد

ابوریحان البیرونی اپنی آثار الباقیہ من القرون الخالیہ میں لکھتا ہے [۲]

"مانی اپنی کتاب شاپور کان مذکور الصدر کے شروع میں کہتا ہے کہ ہمیشہ سے خدا کے پیغمبر وقتاً فوقتاً حکمت و احکام انسان کو پہنچاتے رہے ہیں۔ کبھی وہ ہندوستان میں گوتم بدھ کی معرفت، کبھی ایران میں زرتشت کی وساطت سے۔ کبھی ارض مغرب میں عیسیٰ کے ہاتھ پہنچے۔ اب اس قرن اخیر کی نبوت اور وحی مجھ پر کہ ارض بابل میں خدا کا رسول برحق ہوں، نازل ہوئی۔ وہ اپنے صحیفے میں مدعی ہے کہ وہ فارقلیط میں ہی ہوں جس کی بشارت حضرت مسیحؑ نے دی ہے اور خاتم انبیا ہوں۔ یہ اپنی کتابوں میں دعویٰ کرتا ہے کہ مسیح نے جن باتوں کو مجمل چھوڑا اور صرف اشاروں پر اکتفا کی ہے. میں نے ان کی تصریح و تفسیر کی ہے۔ وہ اصلی اور نقلی مسیح میں فرق کرتا ہے۔ اس کے عقیدے میں اصل مسیح عالم نور کی ایک روح تھا جو عارضی جسم میں دنیا پر نازل ہوئی تھی، اور نقلی مسیح ایک بیوہ کا وہ بیٹا تھا جو مصلوب ہوا۔"

ابن الندیم نے الفہرست [۳] میں دنیا پر نسل انسانی کی ابتدا کے متعلق مانی کے عقائد نہایت صراحت سے بیان کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:۔

"ولد الظلمۃ (شہوات رذیلہ) جن کو ژند میں ارکون کہتے ہیں اور حکمران غالب تھے مزدوج ہوئے۔ اس ازدواج کا نتیجہ انسان اول یعنی آدم تولد ہوا۔ پھر مزید فراد حت سے ایک نہایت خوبصورت عورت حوّا پیدا ہوئی۔ جب فرشتوں نے دیکھا کہ ولد الظلمۃ نے نور اور خوشبو کو شاہ نور کی قلمرو سے نکال کر ان دونوں نوزائیدہ انسانوں میں قید کر رکھا ہے تو انھوں نے شاہ بہشت، انسان قدیم اور روح حیات سے مولود قدیم (عیسیٰ) کے بھیجے جانے کی درخواست کی تاکہ آدم کو شیطانی قید سے آزاد کرائے اور اس کو علم اور نیکی سکھائے۔ چنانچہ عیسیٰ بھیجے گئے اور کچھ دیوتا بھی ہمراہ کر دیے گئے۔ جنھوں نے ارکونوں پر حملہ کر کے انھیں قید کر لیا۔ اور نوزائیدہ انسان کو آزاد کر دیا۔ پھر عیسیٰ نے آدم کو جنت (مرکز نور) جہنم، فرشتوں شیطانوں زمین و آسمان، چاند سورج کی حقیقت بتائی اور حوّا سے متنبہ کر دیا کہ خبردار اس کے قریب بھی نہ بھٹکنا۔

"پھر ارکون اپنی بیٹی حوّا سے ہم بستر ہوا جس کا نتیجہ ایک بھدّی صورت اور سانولے رنگ کا لڑکا قائن (قابیل) پیدا ہوا۔ قائن اپنی ماں سے مزدوج ہوا جس سے ایک گورا چٹا لڑکا ہابیل پیدا ہوا۔ پھر قائن کی دو اور بیٹیاں اس کی ماں حوّا کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ ایک کا نام حکیمۃ الدہر اور دوسری کا نام بنت حرص تھا۔ بنت حرص کو قائن نے اپنی زوجہ بنایا اور حکیمۃ الدہر ہابیل کے حوالہ کی گئی۔ مگر حکیمۃ الدہر میں خدا کا نور اور حکمت عیاں تھی۔ اس پر ایک فرشتہ

---

[۱] ملاحظہ ہو الفہرست ابن الندیم مطبوعہ لیپزک ص ۳۲۸

[۲] ملاحظہ ہو آثار الباقیہ مطبوعہ لیپزک ص ۲۰۷

[۳] ملاحظہ ہو الفہرست مطبوعہ لیپزک ص ۳۳۱ ــــ ۳۳۲

عاشق ہوگیا۔ جس سے اس کے دو بیٹیاں فریاد اور برفریاد پیدا ہوئیں۔ جب ہابیل نے ان کو دیکھا تو غیر کی اولاد پایا اور قائن پر شبہ کیا۔ قائن نے اس اتہام سے خشمناک ہو کر ایک پتھر سے ہابیل کا سر کچل دیا اور حکیمۃ الدہر سے نکاح کرلیا۔ سارے ارکونوں اور ابلیس و حوّا نے قائن کی نعش پر ماتم کیا۔ ابلیس نے آدم کو پھانسنے کے لئے حوّا کو جادو کے کچھ منتر سکھائے۔ چنانچہ وہ پھولوں کا تاج پہن کر آدم کے سامنے آئی۔ آدم ضبط نہ کرسکا اور حوا سے ہم بستر ہوا جس سے ایک خوبصورت آدمی پیدا ہوا۔ جب ابلیس کو یہ معلوم ہوا تو اس لڑکے کی جان کے درپے ہوگیا۔ آدم اُسے حوّا سے لے کر گائے کے دودھ اور پھلوں سے پرورش کرنے لگا۔ ابلیس نے ارکونوں کو بھیجا کہ گائے اور درخت ہٹا کر بچے کو اس سے بھی محروم کرادیں۔ آدم نے بچّے کے گرد تین دائرے کھینچے۔ ایک پر شاہ بہشت، دوسرے پر انسان قدیم اور تیسرے پر روح الحیٰوۃ کے نام لئے اور خدا سے گڑگڑا کر دُعا کی کہ اگر میں نے گناہ کیا تو اس بچّے کی کیا خطا ہے۔ آخر ان تین ارواح میں سے ایک آدم کے لئے ہاتھ میں نور کا تاج لئے ہوئے نمودار ہوئی۔ ابلیس اور ارکنہ نے اسے دیکھا تو سٹ پٹا کر رہ گئے۔ اس کے بعد ایک درخت لوطیس پیدا ہوا جس سے دودھ نکلتا اور بچّہ اسی سے پلتا تھا۔ اس بچے کا نام شاثل رکھا گیا۔

ابلیس نے حوّا کو پھر آمادہ کیا کہ آدم کی طرف جائے اور کسی طرح فریب دے کر اُسے ابلیس کے احاطے میں لے آئے۔ چنانچہ وہ گئی تو پھر آدم ضبط نہ کرسکا اور اس سے ہم بستر ہوگیا۔ شاثل نے یہ دیکھ کر آدم کو بہت ملامت کی اور اسے مشرق میں نور الٰہی کی طرف لے گیا جہاں آدم مقیم رہا اور آخر وفات پر جنت میں پہنچ گیا.....

...... حوّا، قائن (قابیل) اور بنت حرص جہنم میں گئے"

یہ خرافات ہم نے اس لئے نقل کی ہیں کہ ان سے تین نکتے واضح ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض مسیحی مصنفین نے قرآن کو مانی عقائد سے بھی مستنبط بتایا ہے۔ مگر قارئین دونوں کے درمیان بعد المشرقین ملاحظہ فرمائیں۔ دوسرا یہ کہ مسئلہ رہبانیت اور آفرینش عالم کے متعلق وہ روایات جو خود مسیحیوں میں رائج ہیں اور جن کی بنا پر ملٹن کے PARADISE LOST (فردوس گم شدہ) کی عمارت تیار کی ہے مانوی عقائد سے کس قدر ماخوذ ہیں۔ تیسرا افسوسناک نکتہ جو اس سے منکشف ہوتا ہے ظاہر نہ کرنا دیانت کے خلاف ہوگا۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں اسلام میں نور محمدی اور اس کے ازلی یا قدیم ہونے کی روایات کا ماخذ بھی یہی ہے اور ایسی ہی ملحدانہ کہانیاں معلوم ہوتی ہیں[1]۔

زرتشتی و مانوی عقائد میں فرق

ظاہر ہے کہ زرتشت کی طرح مانی بھی عقیدۂ ثنویہ کا مبلغ تھا۔ دونوں نے نور و ظلمت کو مبدء خیر و شر بتایا ہے۔ مگر زرتشتی مذہب میں یزداں و اہرمن روحانی و مادی دونوں صفات سے متصف ہیں۔ اور عقائد سے قطع نظر کرکے زرتشتی مذہب زیادہ تر ایک مادی عملی مذہب نظر آتا ہے۔

[1] عام مسلمانوں کے عقائد پر ملاحدۂ عجم کی تعلیمات کا خفیہ اثر کس قدر رہا ہے آئندہ ابواب میں واضح ہوگا۔

دوسری طرف مانوی تعلیم کے مطابق نور وظلمت کا امتزاج جس سے یہ مادی دنیا مخلوق ہے۔ اصلاً شر اور قوائے خبیثہ کا نتیجہ ہے۔ ایسے سارے اعمال جو اس امتزاج نور وظلمت میں امداد وتقویت بخشیں جیسے ازدواج، توالد وتناسل وغیرہ مانوی عقیدے کے[1] مطابق زرتشت ہیں۔ زرتشتی ایک قومی و اجتماعی سپاہیانہ، مادی، اقتدار پسند دین ہے۔ مانوی ایک عالمگیر و خیرخواہ عالم وخلائق عامہ، راہبانہ، نفس کُش، غیر عملی مذہب ہے۔ لہٰذا اس قدر خارجی مماثلت ومشابہت کے باوجود حقیقۃً واصولاً دونوں باہم نہایت متناقص ومتباین ہیں۔

مانوی احکام مانویوں پر چار یا سات نمازیں فرض تھیں۔ بت پرستی، جھوٹ، طمع، قتل، زنا، چوری، فنون سحر و شعبدہ کی تعلیم، تعلّم، تعصب مذہبی اور فرائض روزمرہ میں غفلت ممنوع تھی۔ ہر ماہ میں سات دن روزے رکھنا اور تین مہروں، قول بد، فعل بد، خیال بد کو محفوظ رکھنا فرض تھا۔ جانوروں کو ذبح کرنا یا ان کو تکلیف دینا اور آگ پانی اور نباتات کو ضرر پہنچانا قطعاً حرام تھا۔[2] ہیجان کی حالت میں اس نے امرد لڑکوں سے اطفاء شہوت جائز رکھا تھا۔ چنانچہ ہر مانوی کے لئے ایک امرد خادم کی قید تھی۔ مگر البیرونی کہتا ہے کہ مانی کی کسی کتاب میں یہ بات میری نظر سے نہیں گزری۔

مانی کی نقاشی مانی کی سات کتابیں، جن میں سے چھ سریانی زبان میں ایک مسمّی شاپُرگان پہلوی میں ہے ایک خاص رسم الخط میں لکھی گئی ہیں جسے مانی نے فوراً ایجاد کیا تھا۔ اس رسم خط پر خصوصاً اور فن تحریر پر عموماً مانویوں نے بڑی توجہ صرف کی۔ الجاحظ ابراہیم السندی سے ناقل ہے کہ "مانوی سفید براق اور نفیس کاغذ، نہایت سیاہ روشن روشنائی اور خطاطوں کی تعلیم وتربیت پر اس قدر بے دریغ روپے صرف نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔" نسخوں کی نقل میں ان کے غیر معمولی سامان، نفاست، زیبائش اور نقش ونگار کے اہتمام خاص ہی کی بنیاد پر بقول جرمن پروفیسر بیوان مانی کی نقاشی اور مصوری کی شہرت پھیل گئی۔

ایران وہند وپاکستان میں عام خیال ہے کہ اس نے ارژنگ کے نام سے ایک مرقع تیار کیا تھا جسے کمال صنعت کو اپنی نبوت پر دلیل اور معجزہ کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا نظامی گنجوی نے نقاشانِ چینی سے مانی کے مقابلہ نقاشی کی پرلطف کہانیاں نظم کی ہیں۔ مگر یہ بعد کی من گھڑت ہیں۔ قدیم تاریخوں میں ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس لئے ان کا دہرانا بے فائدہ ہے۔

(۳) مزدک

پانچویں صدی عیسوی کے اختتام پر، مانی سے ڈھائی سو برس بعد، قباد (پدر نوشیروان) کے عہد میں ایک مدعی نبوت مزدک کا خروج ہوا۔ عہد اسلام کے اکثر ملاحدہ نے اس کے عقائد بھی اخذ کئے ہیں۔ نظام الملک طوسی نے عام ملاحدہ کے عقائد کو مزدکیوں سے ماخوذ بتایا ہے اس لئے مزدک کے حالات اور خیالات کو کسی قدر تفصیل کے

---

[1] جرمن فلسفی ومصلح نیچے نے شاید اس لئے اپنی تعلیم وفلسفہ زرتشت کی زبان سے نکلوایا ہے اور اپنی کتاب کا نام رکھا ہے۔ "زرتشت کا یہ ارشاد ہے"

[2] آثار الباقیہ البیرونی مطبوعہ لیبزک ص ۳۰۷

ساتھ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

مزدک کے متعلق نظام الملک نے سیاست نامہ مؤلفہ ۴۸۴ھ / ۱۰۹۱ء میں صراحت کے ساتھ بحث کی ہے اور ہم مزدک کے حالات اسی سے اخذ کرتے ہیں۔

ابتداءً یہ شخص زرتشتیوں کا ایک جلیل القدر پیشوائے مذہب تھا اور موبد موبداں کے لقب سے سرفراز تھا۔ یہ علم نجوم کا ماہر اور اوستھا کے رموز کا بڑا عالم تھا۔ شاہ قباد بن فیروز کے دربار میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس نے ایک محفوظ مقام سے آتشکدہ تک خفیہ طور پر ایک سرنگ کھدوائی اور خاص آتشدان کی طرف بہت باریک سوراخ کرایا۔ اس سامان کے سرانجام کے بعد اس نے اپنی پیغمبری کا اعلان کر دیا اور یہ دعوی کیا کہ میں دین زرتشتی کے تازہ کرنے کو مبعوث ہوا ہوں۔ دنیا نے اوستھا کے معانی کو بھلا دیا ہے اور زرتشت کی شریعت کے مطابق احکام یزدانی بجا نہیں لاتی۔ میں دنیا کو از سر نو شریعت کی تعلیم دوں گا۔ اس نے اپنے دعوے کی دلیل میں یہ معجزہ پیش کیا کہ آتشکدہ میں تمام موبدوں بزرگوں اور شاہ قباد کو جمع کر کے کہا کہ یہ مقدس آگ میری نبوت پر شہادت دے گی۔ اس نے بلند آواز سے یزداں کا نام پکارا۔ زرتشت پر درود پڑھا اور چپ ہوگیا۔ بھٹی سے دھیمی دھیمی آواز آئی "صلاح یزداں پرستانِ زمین در راستی است که سخن مزدک بر کار گیرند تا نیک بختی دو جہاں یابند" دراصل قرار داد کے مطابق مزدک کے ایک آدمی نے سرنگ سے یہ آواز دی تھی۔ اس معجزہ کا اثر یہ ہوا کہ عوام الناس دل سے اس کے قائل ہوگئے اور موبدوں کی زبان اعتراض بند ہوگئی۔ خود قباد کی نظر میں اس کا احترام بہت زیادہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کے لئے سونے کی کرسی بنوا کر دربار میں اپنے تخت کے برابر اس کی نشستگاہ مقرر کی۔

بقول نولدیکے زیادہ تر موبدوں اور دربار کے امرا کے حد سے بڑھے ہوئے زور اور اختیار کو توڑنے کے لئے قباد نے مزدک کے دین کا خیر مقدم کیا۔ لوگ جوق در جوق اس کے مذہب میں داخل ہوتے جاتے تھے، کچھ تو اپنے دلی اعتقاد سے اور کچھ الناس علیٰ دین ملوکہم کے اصول پر۔ مگر اہل فوج پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔ تاہم بادشاہ کے خوف سے وہ بھی مزدک کے خلاف زبان ہلانے سے مجبور تھے۔ اسی طرح موبدوں کی زبان پر بھی مہر سکوت لگی تھی۔

بنائے سوشلزم

مزدک نے اپنے مذہب کو ساری دنیا میں مقبول عام بنانے اور طبقہ عوام کو اپنے طرف مائل کرنے کی غرض سے ایک ایسی تعلیم کی بنیاد ڈالی جو آج تک ایک خدائی کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہے اور جسے سوشلزم کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اس نے تلقین کی کہ سارا مال و متاع خدا کا دیا ہوا ہے جس میں ہر بندۂ خدا برابر کا حقدار ہے۔ سب آدم کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی پر فائق ہونے یا کسی کو کسی کا حاجتمند ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ چاہیئے کہ سارے بنی آدم ایک ہی حال میں ہوں۔

جب مزدک نے دیکھا کہ قباد یہاں تک اس کی تعلیم سے تعرض نہیں کرتا تو وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور یہ اضافہ کیا کہ عورتیں بھی مال ہی ہیں۔ ان کے استعمال میں بھی فرق و امتیاز کی کوئی وجہ نہیں۔ انھیں بھی ایک دوسرے کا مال سمجھے تاکہ کوئی دنیا کی اس لذت سے محروم نہ رہ جائے۔ اس آزادی کی بدولت حسب توقع عوام نہایت کثرت سے مزدک کے پیرو ہوگئے۔

اس کے بعد جو طوفان بدتمیزی برپا ہوا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مہمان کی ضیافت میں میزبان کو اپنے حرم کی حرمت تک سے

دریغ رکھنے کی مجال نہ تھی۔ دیوتی اس کے پیروں کے لئے شرط لازمی بن گئی تھی، اور صلح دامن پر ہر طرف سے خطرات منڈلا رہے تھے۔ پھر بھی قباد کی عقید تمند آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ایک روز قباد کی بیوی (نوشیرواں کی ماں) اس کے پاس بیٹھی تھی کہ مزدک آگیا۔ ملکہ کو دیکھ کر اس نے قباد سے کہا کہ یہ عورت مجھے دے دے۔ عقیدتمند قباد نے کہا۔ آپ کی نذر ہے لے جائیے۔ نوشیرواں موجود تھا۔ اٹھ کر منت سماجت شروع کی اور پاؤں چومے، تب اس نے ملکہ کو چھوڑا۔ نوشیرواں کے دل میں اسی دن سے مزدک کی نفرت بیٹھ گئی۔[1]

نوشیرواں کا آغاز شباب تھا۔ ۱۸ سال کی عمر تھی۔ شہزادے نے سلطنت کو اس خطرۂ عظیم میں مبتلا اور اخلاق کو رسوا ہوتے دیکھ کر موبدوں سے مشورہ کیا۔ ان کے دلوں بلکہ ایمانوں کو تقویت دے کر اس غول بیابانی میں شرکت سے انھیں محفوظ رکھا۔ ورنہ یہ سیلاب انھیں بھی ڈبو چکا تھا۔ آخر موبدوں نے جمع ہو کر قباد کے سامنے ان تعلیمات فاسدہ کے خلاف آواز بلند کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پھر مزدک نے ان احکام کو زرتشت کا ارشاد اور ژند اوستھا سے مستخرج بتایا اور کہا کہ لوگ اس کی تفسیر نہیں جانتے۔ اگر میری بات کا اعتبار نہ ہو تو آگ سے پوچھ لو۔ چنانچہ آگ سے سوال کیا گیا۔ جواب آیا کہ مزدک ٹھیک کہتا ہے۔ موبد پھر شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

جب مزدک نوشیرواں کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ ہوا تو اس نے قباد سے کہہ کر نوشیرواں کو اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہا۔ شہزادہ نے کچھ دنوں کی مہلت لی اور پارس کے شہر کول سے ایک بہت کبیر السن اور فاضل روزگار موبد کو بلوا بھیجا۔ اس نے قباد کی خدمت میں عرض کیا۔ "مزدک نے یہ دعویٰ علم نجوم کی بناء پر کیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس قرن میں ایک پیغمبر ظاہر ہوگا جس کا دین گبروں (مجوسیوں)، یہودیوں، عیسائیوں اور بت پرستوں کے ادیان کو باطل کر دے گا اور قیامت تک قائم رہے گا۔ مگر اس میں اس کو دھوکا ہوا ہے۔ جو پیغمبر اس عہد میں مبعوث ہوگا اس کے پاس ایک نادر کتاب ہونا چاہئے، اس کے دین کو پسندیدہ اخلاق کی تعلیم دینا چاہئے، جنت کی امید اور جہنم کی وعید ہونا چاہئے، اسے مال اور حرم کی حفاظت کرنا چاہئے۔ اسے فرشتے کے ساتھ تعلقات چاہئے اور شیطان کے پنجے سے خلق اللہ کو نجات دلانا چاہئے۔ اسے آتشکدے اور بتکدے ویران کرنا چاہئے۔ وہ پیغمبر عجمی نہ ہوگا۔ وہ زنا، چوری، غصب کو حرام قرار دے گا۔ مگر مزدک اور اس کے اعمال ان تمام آثار و علامات کے خلاف ہیں۔ دراصل وہ تجھ کو تاج و تخت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔"

قباد پر اس بڈھے موبد کی تقریر کا بہت کچھ اثر ہوا۔ دوسرے روز مزدک سے مناظرہ ہوا۔ موبد نے مزدک سے پوچھا۔ "خیرات کرنا کیسا ہے؟" اس نے جواب دیا "بہت اچھا ہے۔" موبد نے کہا "تمھارے مذہب کی رو سے جب ساری خدائی ہر مال میں برابر کی شریک ہے تو سب برابر اور ہم رتبہ ہوئے تو پھر خیرات کون کس کو دے اور کیوں دے، لہذا پل کنوئیں، مسافر خانے، لنگر خانے اور تمام صدقات باطل ہو گئے، اسی طرح بڈھے نے عورت کے اشتراک زوجیت کی دقتوں اور باپ بیٹوں کی تمیز کے اٹھ جانے کو ثابت کیا۔ سلطنت کی ضرورت رفع ہو جانے کے بعد ملوک عجم کے خاندان

---

[1] کامل ابن الاثیر جلد سوم

سے سلطنت چھنوانے کی نیت کا الزام بھی عائد کیا۔ مزدک لاجواب ہوگیا۔ اس کے پاس سرنگ کا ہتھکنڈا رہ گیا تھا۔ دوسرے روز کے لئے آگ پر اپنی تصدیق حصر کی۔ قباد کا رُخ وہ پہچان چکا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر اپنے دو معتمد چیلوں کو بیش قرار انعام واکرام کا وعدہ دے کر آمادہ کیا کہ دوسرے روز جب آتشکدے میں اجتماع ہو تو یہ تلوار کپڑ دیں (جو آتشکدے کی بے حرمتی اور خلاف قانون فعل سمجھا جاتا تھا) حسب قرار داد جب آگ قباد کے قتل کا حکم دے تو فوراً جھپٹکر اس کا کام تمام کردیں۔ اُدھر نوشیرواں نے بھی مزدک کے شر کے اندیشے سے اپنے دس آدمی خفیہ مسلح کرکے آتشکدے میں جمع کرلئے۔ جب مزدک کے بلند آواز سے آگ سے اپنی صداقت کی شہادت طلب کی آواز آئی "میں بہت ضعیف ہوگئی ہوں۔ پہلے مجھے قباد کا دل اور جگر کھلاؤ پھر بتاؤں گی کیا کرنا چاہئے" مزدک چلایا "آگ کو قوت دو، آگ کو زور دو" دو آدمی تلوار کھینچکر قباد پر ٹوٹ پڑے۔ فوراً نوشیرواں کے دس آدمی بھی تلواریں لے کر حائل ہوگئے اور قباد کو بچالیا۔ مزدک یہی کہے جاتا تھا کہ "آگ کو طاقت دو۔ آگ خدا کا پیغام سُناتی ہے" حاضرین میں دو گروہ ہوگئے۔ ایک قباد کو قربان کرنے کے حق میں تھا اور دوسرا تامل کرنے کی رائے دیتا تھا۔ بیچارہ سہل الاعتقاد قباد کہنے لگا "ضرور مجھ سے کوئی ایسا ہی گناہ سرزد ہوگیا ہے جس کی پاداش میں آگ میرے دل و جگر کی خوراک مانگتی ہے۔ بہتر ہے کہ مجھے آتش مقدس کی نذر کردو کہ دوسرے جہان میں عذاب سے رہائی پاؤں۔

بڈھے موبد کی ہدایت سے نوشیرواں نے ایک محرم راز مزدکی کو ایک ہزار اشرفی نقد اور مزید عطایا کے وعدے سے سرنگ کا راز دریافت کرلیا اور باپ کو اس سے مطلع کرکے مطمئن کردیا۔ مگر مزدک اور اس کے مذہب نے اس وقت تک اس قدر زور پکڑ لیا تھا کہ اس کا یکبارگی علانیہ استیصال ناممکن تھا۔ نوشیرواں نے قباد کی رضامندی سے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بڈھا موبد رخصت ہوگیا۔ مزدک کو یقین دلایا گیا کہ اب نوشیرواں بھی دین مزدک کی طرف مائل ہوگیا ہے۔ جب مزدک بالکل مطمئن ہوگیا تو ایک روز نوشیرواں نے قباد کی زبانی مزدک سے کہلوایا کہ "نوشیرواں دل سے اس دین کا معتقد ہے مگر اس اندیشے سے اعلان نہیں کرتا کہ بہت سے لوگ جو اس دین کے خلاف ہیں کہیں باغی نہ ہوجائیں اور اسے سلطنت سے محروم نہ کردیں، لہٰذا وہ دین مزدکی کی موجودہ قوت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اگر ان کی تعداد اور طاقت کافی ہے تو اپنے اقبال دینِ مزدکی کا اعلان کردے گا ورنہ کچھ دن اور صبر کرے گا" یہ دھوکا دے کر تمام مزدکیوں کے ناموں کی مکمل فہرست حاصل کرلی جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تھی۔ نوشیرواں نے اپنا اطمینان ظاہر کیا اور نقارہ بجواکر دین مزدکی کا اعلان کردیا۔

نوشیرواں نے مزدک کا اعتمادِ کلی حاصل کرکے اسے آمادہ کیا کہ اس دین کی تبلیغ کے لئے اسے اپنے تمام پیرووں کا سالار اعظم بنادے اور سارے جہاں میں یہ مذہب بزور شمشیر پھیلادے۔ تمام مزدکیوں کو گھوڑوں، لباس اور اسلحہ سے آراستہ کرنے کے بہانے سے اس نے ان کی عام دعوت کی۔ بیس بیس یا تیس تیس مزدکیوں کی ٹولیاں بنا کر ان کو پر تکلف کھانا کھلاتا۔ قیمتی شرابیں پلاتا۔ پھر دوسرے گھر میں لے جاکر اسلحہ اور خلعت بخشتا۔ پہلے سے ایک گھرے ہوئے میدان میں قبریں کھدا رکھی تھیں اور سیکڑوں مسلح سپاہی تعینات کر رکھے تھے۔ آخر میں ان مہمانوں کی ایک ایک ٹولی کو وہاں پہنچا کر اسے تلوار کے گھاٹ اتارا جاتا اور قبروں میں اس طرح گاڑ دیا جاتا کہ دھڑ زمین میں اور ٹانگیں

اور نکلی ہوئی۔ اس طرح ایک ایک ٹولی کر کے تمام بارہ ہزار مزدکیوں کو الٹا گاڑ دیا۔ آخر میں نوشیرواں نے قباد اور مزدک سے عرض کیا "ذرا چل کر میدان میں ملاحظہ فرمائیں۔ تمام مزدکی بھائیوں کو میں نے کس طرح خلعت سے آراستہ کر کے میدان میں مرتب کر دیا ہے۔" میدان میں ٹانگوں کا جنگل دیکھ کر مزدک نوشیرواں کا منھ تکنے لگا۔ نوشیرواں نے کہا "جس لشکر کا سردار تو ہو اس کے لئے اس سے بہتر خلعت نہیں ہو سکتا۔" میدان کے وسط میں ایک بلند چبوترا تھا۔ جس پر ایک خالی قبر تیار تھی۔ اس میں مزدک کو اسی طرح سر کے بل دفن کر کے اس "ٹانگوں کے سردستان" کی تکمیل کر دی، جو سارے شہر کا تماشا گاہ اور عبرت کدہ بن گیا۔

نوشیرواں نے ۱۳۵ھ میں تخت نشین ہونے کے بعد بھی بچے بچائے مزدکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مٹایا۔ جازر سے نہرواں اور مدائن تک ایک دن میں ایک لاکھ زندیقوں کو مار کر لٹکوا دیا۔ کہتے ہیں کہ اسی روز اس کا نام نوشیرواں رکھا گیا۔

مزدکیوں کے اس استیصال کامل کے بعد بھی کچھ بچا بچایا زہر پایہ تخت سے دور دراز مقامات پر بدہوائی پھیلاتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس کی بیوی خرّم خراسان میں پناہ گزیں ہوئی اور شوہر کے دین کی تبلیغ میں کامیاب ہوئی۔ اس کے نام پر بعد میں اس دین کا نام دین خرمی مشہور ہو گیا اور عہد اسلام میں مختلف ناموں اور لباسوں میں جلوہ دکھاتا رہا۔

پروفیسر براؤن اپنی تاریخ ادبیات ایران میں فرماتے ہیں "مزدک کی طرف جو عقائد منسوب ہیں ان کا بانی آیا واقعی مزدک ہے یا کوئی اور، یہ مشتبہ امر ہے۔ کیوں کہ بعضوں نے صوبۂ فارس کے شہر خسا کے ایک مجوسی ابن خرگان کو ان خیالات کا اولین موجد بتایا ہے۔ بہر حال بانی اور مخترع کوئی ہو ان خیالات کی اشاعت اور ترقی مزدک کے ہاتھوں ہوئی۔"

مانی و مزدک

مانی اور مزدک دونوں یہاں تک متفق ہیں کہ اشیاء متفرقہ دو مطلق اور ازلی عناصر شید (نور) اور تار (ظلمت) سے رونما ہوئی ہیں۔ مگر مانی کے برخلاف مزدک نور و ظلمت کا اتصال و افتراق دونوں اتفاقی قرار دیتا ہے اور کسی ارادہ یا اختیار کا نتیجہ نہیں سمجھتا۔ پروفیسر نولدیکی نے اس کی تعلیمات کے متعلق نکتہ پردازی کی ہے کہ مزدکی عقائد اور جدید سوشلزم یا اشتراکیت میں کوئی اصولی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ مزدک نے ان کو مذہبی جامہ پہنا دیا تھا۔ مزدک کے عقائد کے مطابق تمام شر و رکے مبدء شیاطین حسد و غضب و حرص ہیں جنھوں نے خلق اللہ کی مساوات کو غارت کر رکھا ہے۔ جسے وہ دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مانوی مذہب کی رہبانیت دین مزدکی میں اس حد تک موجود نظر آتی ہے کہ خونریزی اور گوشت خواری ممنوع ہے۔ مگر زن و زر کی تقسیم و اشتراک کے ساتھ یہ پرہیزگاری کہاں تک مناسبت رکھتی ہے محتاج بیان نہیں۔

نظیر نمبر
جس میں نظیر اکبرآبادی کا مسلک، اس کا فارسی تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعرا کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر بہر حاصل تبصرہ ہے۔
قیمت:- ۳ روپے
نگار پاکستان - ۳۲ - گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

حالی غزل گو کی حیثیت سے

(سعادت نظیر)

۱۸۵۷ء تک ہندوستانی تمدن جاگیرشاہی نظام کا پروردہ تھا امراء و سلاطین کی مدح سرائی میں زبانیں خشک تھیں۔ روایت شکنی گناہ تھی۔ عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ ہوا و ہوس کا بازار گرم تھا اور امرد پرستی و شاہد بازی کا رواج تھا۔ عاقبت بینی سے کورے دل محبت کی عارضی حلاوتوں میں ڈوبے ہوئے اور وصال و فراق کی کش مکش میں کھوئے ہوئے تھے، حسن و عشق کے ترانے خواہ اصلی ہوں کہ ذہنی، گنگنائے جاتے تھے، فضا چنگ و رباب کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ ادب شاعری تک اور شاعری غزل تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی داستانیں چھڑی ہوئی تھیں۔ شاعر اپنی انفرادیت کے خول میں پناہ گزیں تھے اور کشاکش ہائے روزگار سے بے نیاز، لفظی بازی گری میں مصروف۔ دور از کار تشبیہوں اور مبہم استعاروں کے جال بننے میں منہمک نظر آتے تھے۔ شخصی شاعری کے دلدادہ سخنوروں نے کثرتِ استعمال سے فصاحت و بلاغت کے سحر آگیں اصولوں کی بے حرمتی کی اور غزل جیسی لطیف صنفِ سخن کو صنائع بدائع کے ارادی تصرف سے بے کیف و بے اثر کر دیا تھا، واقعہ نگاری و محاکات سے معرا تخیل کی اُڑان نے شعر کو گورکھ دھندا بنا دیا تھا اور غزلیہ شاعری کا چکر "ہائے گل" اور "ہائے دل" ہی کے محور پر گھومتا رہتا تھا، غزل کی اسی رنگیں دنیا میں نئی شاعری کے نقیب خواجہ الطاف حسین حالی نے ہوش سنبھالا، ماحول کے اثر اور جوانی کی ترنگ نے انھیں بھی سازِ غزل چھیڑنے پر اکسایا، دل میں ولولے کروٹیں لینے لگے، محرکات، خارجی ہوں یا داخلی، غرض یہ کہ جذبات جاگ اٹھے۔ غالب اور شیفتہ جیسی صاحب ذوق اور نقاد نظر ہستیوں کی صحبتیں ان کے مذاقِ سلیم کے لئے سونے پر سہاگا ثابت ہوئیں۔ اس لئے ان کی ابتدائی شاعری کا دامن بھی عام فرسودہ شعری رجحانات سے داغ دار نہ ہونے پایا۔ البتہ ان کے یہاں کہیں کہیں ایسے قدیم گل بوٹے نظر آتے ہیں جو ان کے معاصرین کے پاس بھی موجود ہیں مگر ان کے نکتہ آفریں اندازِ کلام اور مخصوص لب و لہجہ نے قدیم گل بوٹوں کو ایک تنوعی رنگ دے کر اُن کی انفرادیت کو مجروح ہونے سے محفوظ رکھا ہے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؛ اب ٹھہرتی ہے، دیکھیے جا کر نظر کہاں؛
ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں!

رات اُن کو بات بات پہ سو سو دیے جواب مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت
بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ اب وہ اگلی سی درازیِ شبِ ہجراں میں نہیں

میرؔ کے سوز و گداز، دردؔ کے راز و نیاز، غالبؔ کے فکر و نظر کی تازگی اور شیفتہؔ کی شائستہ سادگی کے اثرات اور ان کے اپنے محسوسات و جذبات کی تہذیب کا حسین امتزاج بجائے خود ان کے تغزل کی ایک ممتاز خصوصیت ہے اور اس کے علاوہ جو بات ان کی غزل میں نمایاں نظر آتی ہے، وہ ان کی اپنی سادہ اور پُر خلوص شخصیت کا دل کش پرتو ہے ؎

ٹپکتا ہے اشعارِ حالیؔ سے حال　　کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

ہوں گے حالیؔ سے بہت آوارہ　　گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی　　وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

حالیؔ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز　　یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

حالیؔ کی دل آویز شخصیت جس فضا میں ابھری، وہ بڑی حوصلہ فرسا تھی، اسی باعث ان کی طبیعت میں سخت کوشی اور زندگی میں سادگی آ گئی۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا، اس سانحے نے ان کے فطری احساسات میں تڑپ اور ذہنی قوتوں میں تیزی پیدا کر دی تھی۔ ہوش سنبھالا تو ان کا دل دردِ انسانی سے معمور تھا۔ کسی کا دکھ اُن سے دیکھا نہ جاتا تھا، اوروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے اور بے تاب ہو جاتے تھے۔ گویا دردمندی اور ہمدردی ان کا مقدّر تھی۔ عمر کے سترہ سال بھی پورے نہ ہونے پائے تھے کہ خلافِ مرضی ازدواجی زندگی کے بندھنوں میں جکڑ دیئے گئے اور دائرۂ ملازمت میں بھی آنا پڑا مگر علم کی لگن میں گھر والوں سے چھپ کر دہلی گئے اور مشرقی علوم کی تحصیل کی۔ بدلتے ہوئے حالات کا مطالعہ کیا۔ سرسیّد کی تحریک سے رفتارِ وقت اور تقاضائے زمانہ کا مزید احساس ہوا اور اصلاحی نقطۂ نظر کو اپنایا۔ مذہبی تعلیمات سے انکسار، انصاف، رواداری اور خلوص و محبت سیکھی، دنیا کے نشیب و فراز اور گردشِ لیل و نہار کی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرے لیکن اعتدال پسند مزاج نے انھیں کبھی بھٹکنے نہ دیا اور نہ سپردگی و بیچارگی ہی مسلکِ حیات بننے پائی، انھوں نے جہدِ مسلسل کو زندگی کا مقصود سمجھا، خود اعتمادی، ضبط و تحمل اور متانت تو ان کی شخصیت کے خاص عناصر تھے ہی۔ خوشی کے موقعوں پر وہ مسکرا دیتے، شدّتِ غم میں بجائے آہ و فغاں ضبط سے کام لیتے اور جذبات کی رَو میں کبھی نہ بہتے تھے کیونکہ وہ عقلِ پختہ کار بھی رکھتے تھے اور حقائق سے گریز کو کفر جانتے تھے اسی لئے ان کی غزلوں میں نہ صرف دل کی سچی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں بلکہ شعورِ بیدار کی گل کاریاں بھی دکھائی دیتی ہیں اور دل و دماغ کے انھیں خاصوں کی لطیف آمیزش نے ان کے تغزل کو اک نیا نکھر۔ "تغۂ رنگ" عطا کیا ہے۔

عشق ادھر، عقل ادھر دُھن میں چلے ہیں تری　　رستہ اب، دیکھئے! دونوں میں کٹھن کس کا ہے

جس دل کو قیدِ ہستی دنیا سے تنگ تھا　　وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب

حالیؔ رودادِ دل سناتے ہیں اور اس سلیقے سے سُناتے ہیں کہ سننے والا سمجھنے لگتا ہے کہ یہ اسی کی کہانی ہے۔ اور دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ قوم کی سرگزشت بھی سناتے ہیں، عیب گنانے اور نصیحت کرنے میں لگی لپٹی انھیں نہیں آتی۔ پھر بھی سُننے والے جزبز نہیں ہوتے بلکہ اپنے عیوب کا جائزہ لینے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں بے خبری اور بے خودی کی جگہ ایک ہوش مندانہ اور دور اندیشانہ کیفیت ہے، ان کا حسنِ بیان پُرکار کم اور سادہ زیادہ ہے اور وہ کونسا دل ہے جو اس سادگی پر نہ ریجھے، الفاظ میں نرم اور مدھم ترنم، بندش میں چستی، اندازِ بیان میں برجستگی اور لب و لہجہ میں وہ دل کشی کہ احساس میں کسک سی محسوس ہوتی ہے ؎

رنجش و التفات و ناز و نیاز　　ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

اب وہ اگلا سا التفات نہیں　　جس پہ بھولے تھے ہم، وہ بات نہیں

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ　　ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم | کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

حالیؔ کی جمالیاتی غزلوں میں دل نشیں داخلیت بھی ہے اور سکوں بخش و نگاہ فروز وسعت بھی، البتہ اس میں وہ حسین دیوانگی نہیں جو لاشعور کی دین ہوتی ہے، تخیل کی بے جا پرواز اور خواہ مخواہ کی معنی آفرینی بھی انھیں پسند نہیں اور وہ شعر کو پہیلی بھی بننے نہیں دیتے۔ اگرچہ بہت سی باتیں کھل کر کبھی نہیں کہتے اور انھیں ادھوری چھوڑ جاتے ہیں مگر ان کے کنایے بھی ایسے ہوتے ہیں جو تصریح سے کہیں بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم | سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
آدمی ہو تو کبھی پاسِ محبت کے نہ جلئے | اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

حالیؔ کی غزل میں ایک کیف آگیں نغمگی ہے مگر اس نغمگی سے زیادہ وارداتِ قلبی کی جھلکیاں ہیں۔ ان کا افسانۂ محبت قدیم ہوتے ہوئے بھی قدیم نہیں بلکہ اپنے اندر تازگی و شگفتگی کی بہار اور ایک دنیائے رنگ و بو رکھتا ہے ؎

نیا ہے، لیجئے جب نام اس کا | بڑی وسعت ہے میری داستاں میں
عمر شاید نہ کرے آج وفا | کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

غزل کا اصلی موضوع عشق و محبت ہے اور ہر شاعر کی زندگی میں تمام تر الفت ہی کار فرما ہوتی ہے، اگر یہ مان بھی لیں کہ حالیؔ کی غزلیہ شاعری ان کے اپنے زمانے کے دستور کے مطابق تھی تو بھی ان کی غزلوں میں ایسے بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں جن سے عشق کے سچے جذبات کا پتا چلتا ہے۔ یہ طرفہ کمال ہے کہ عاشق نہ ہونے پر بھی عاشقانہ کیفیات کا احساس اور اس کا ایسا اثر آفریں اظہار کہ ہر سننے والا انھیں سچا عاشق سمجھ لیتا ہے یا ان کی غیرت نے انھیں اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی محبت کو اجاگر نہ ہونے دیں اور "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کا پیرایہ اختیار کریں، خیر، جو کچھ ہو مگر ان کی غزل اور حاصلاتِ غزل اس کی پوری غمازی کرتے ہیں کہ ان کے دل پر بھی پیار کی چوٹ لگی تھی اور اسی چوٹ نے انھیں حسنہ و برشتہ کر دیا تھا اسی لئے وہ حکایاتِ حسن و محبت مزے لے کر بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کا عشق افلاطونی عشق نہیں اور وہ حسنِ ماوراء کے پرستار بھی نظر نہیں آتے بلکہ انسانوں جیسی محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں اور حدودِ شرافت میں رہ کر اس کی مناسب ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فطری جذباتِ عشق کی پاکی کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کی معصومیت کا تصور بھی ملتا ہے ؎

عشق سمجھے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید | خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر | بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیبی روایتیں دم توڑنے لگیں، ذہنوں پر جمود چھا گیا۔ جذبات مایوسی اور شکست خوردگی سے گھائل ہو گئے، دلّی تباہ ہو گئی اور عشقیہ نغمات نوحوں سے بدل گئے اور حالیؔ اس کا مرثیہ ان الفاظ میں پڑھتے ہیں ؎

جتنے رستے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق | آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ | نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
داستاں گل کی، خزاں میں نہ سنا اے بلبل | ہنستے ہنستے ہمیں، ظالم! نہ رلانا ہرگز

ادب زندگی کا ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں زمانے کی معاشی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی صورتیں اہلِ نظر کو صاف دکھائی

دیتی ہیں، جب ہندوستان کی ثقافتی اور تمدنی قدریں بدلیں تو ادب میں بھی ایک انقلاب رونما ہوا۔ صنفِ غزل پر، جو تعیشات ذہنی کا ایک آلہ بنی ہوئی تھی اور جس کے حقیقی خط و خال تکلف و تصنع اور آرائش و زیبائش کے پردوں میں چھپ گئے تھے۔ کاری ضرب لگی، اس ادبی تغیر کا ایک مفید اثر یہ مرتب ہوا کہ شعر و ادب کی نئی راہیں کھلیں، فکر و نظر کو مغربی ادب کے تصورات کی روشنی ملی، مادیت و حقیقت پسندی کا ہر شعبۂ حیات میں جاری و ساری مزاج عطا ہوا اور یہی مزاج غزل نے بھی قبول کیا۔

یہاں سے ہمارے شعر و ادب نے ایک نئی کروٹ لی۔ اس ادبی انقلاب کے علم برداروں میں حالی کو پیش پیش سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ بھی اپنے طبعی تقاضوں اور حالاتِ حاضرہ کی ضرورتوں کے مدِ نظر، ترقیٔ شعر و انشا اور صنفی تنوع بدرجۂ اتم چاہتے تھے۔ اور اپنی اسی چاہت کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے غزل میں بڑا زور مارا اور مسائلی شاعری کا اضافہ کیا، اگرچہ حسن و عشق اور اس کے متعلقات کے علاوہ نیرنگیٔ روزگار کے اثر سے غزل کے لئے خارجی مسائل کا ذریعۂ اظہار بننا کوئی نئی بات نہ تھی مگر یہ خارجیت مستقل نہیں، ایک عارضی حیثیت رکھتی تھی، حالی نے روددادِ زندگی کے ہر پہلو کو جزوِ غزل بنا دیا، حالاتِ زندگی کا جائزہ لیا، ہنگامۂ ہستی پر حکیمانہ تبصرہ کیا، نئے شعری رجحانات کی ترجمانی کی اور حسن و عشق کی خالص شاعری کو بے وقت کی راگنی سے تعبیر کیا، نہ صرف یہ بلکہ غلام و مفلس ہندوستانیوں کو جن پر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود غفلتوں کا خوابِ گراں طاری تھا، میٹھی میٹھی لوریاں دے کر خوابِ گراں کو اور گراں کرنے کے بدلے جھنجھوڑ کر انھیں بیدار کرنے کے لئے بھی غزل ہی کو آلۂ کار بنایا۔

حالی باشعور اور بڑے فن کار تھے، غزل کے فنی تقاضے اور اس کی نازک مزاجی سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ مروجہ غزل میں حسن و عشق کی منزل سے آگے بڑھنے کا دم خم ہے اور نہ اس کے مفروضات و مسلمات میں خارجی حالات و واقعات کی عکاسی کا کس بل اس پر بھی تمام اصنافِ سخن کے اس جادو اثر مجموعے سے کام لیا، اس کا سانچہ تو برقرار رکھا، موضوع اور موضوع کے مزاج کو بدل دیا، اس کو سماجی شعور کی رعنائیاں دیں، نیا آہنگ اور نیا آب و رنگ عطا کیا، اپنی غزل کی داخلی لطافتوں کو کم سے کم کیا اور اس کو سماجی مشاہدات و تجربات سے آراستہ کر کے حیات و کائنات کے تغیرات کا مرقع بنایا، سوقیت، بے جا مبالغے اور کنگھی چوٹی کی باتیں نکال کر اس کے معیار کو بلند تر کر دیا، اظہار و ابلاغ میں اس کے افادی پہلو کو مقدم سمجھ کر اس صنف کو اپنے میلانات و تجربات کی جولاں گاہ بنایا۔ زورِ طبیعت اور قدرتِ کلام سے اُسے وسعت دینے کی اور اس کے ذریعے "ادب برائے زندگی" کے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی سعیِ جمیل تو کی، کامیابی اور ناکامی کی اور بات ہے، البتہ یہ ایک قابلِ اعتراف حقیقت ہے کہ وہ اپنے اس تجربے میں ایک حد تک کامیاب ضرور ہوئے مگر اس کٹھن راستے پر ان کے اتباع میں ہر کس و ناکس کا قدم اٹھانا معلوم! پند و نصائح، حکمت و تصوف اور ہدایت و اصلاح کے لئے غزل کی نازک زبان کا برتنا مشکل ہے اور پھر اس طرح برتنا کہ سننے والے اس کا اثر قبول کریں، اور بھی مشکل ہے لیکن حالی کے کیا کہنے کہ انھوں نے اپنی قوتِ کلام اور جودتِ طبع سے مسائلی غزل میں بھی وہ اعجاز دکھایا کہ بعض شعروں پر تو زبان سے بے اختیار "واہ" نکل جاتی ہے ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا | ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے | اور معرکہ گردشِ ایام ہے درپیش
وہ وقت گیا، نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا | اب وقتِ خمارِ مئے گلفام ہے درپیش
دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھتے تھے ہم اول | آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

حالی کا سماجی شعور گہرا تھا۔ اپنی سوسائٹی کی خرابیاں دیکھ کر ان کے جو تاثرات ہوتے اور اصلاحی نقطۂ نظر سے اُن کے

دل و دماغ میں جو فکر و احساس انگڑائیاں لیتا، اس کو وہ کم و بیش ایسے ہی اسلوب سے شعر کا روپ دیتے، جیسے کوئی چاہنے والا اپنے محبوب کو غائبانہ گلے شکوے کر کے مائل بہ التفات کرنا چاہتا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ رنگِ تغزل اڑتا جاتا ہے حتیٰ کہ ان کی غزل کے جھین پردوں سے کبھی کبھی اجتماعی طنز و تعریض اور خارجیت کی ناگوار صورت نظر آنے لگتی ہے اور وہ کہیں کہیں بالکل بے پردہ سامنے آجاتی ہے تو دلدادگانِ غزل اسے دیکھ کر منھ پھیر پھیر لیتے ہیں ؎

صلح ہے اک فرصتِ سامانِ جنگ — کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے — سوا اس کے منعم میں ہے کیا برائی!

دوست گر بھائی نہ ہو، دوست ہو تو بھی لیکن — بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطون سے بہتر ہے — یہ وہ نکتہ ہے، سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

پھر بھی اُردو غزل کی تاریخ میں حالیؔ کی شاعرانہ عظمت مسلمہ ہے، اس عہد آفریں شاعر کا بڑا احسان تو یہ ہے کہ اس نے غزل کو عصری اور معیاری بنانے میں اپنی عالمانہ اور حکیمانہ صلاحیتوں سے کام لیا، اس کو "پیامِ حیات" بنایا، جاں بخش اقدار دیئے اور آنے والی نسلوں کے لئے منزلِ مقصود کی ایک نئی شاہراہ کھولی، اس شاہراہ پر چلنے نہ چلنے اور منزلِ مقصود پر پہنچنے نہ پہنچنے کو نئی پود کی مساعیٔ جمیلہ اور حوصلہ مندیوں پر چھوڑ دیا ؎

گو کہ حالیؔ اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش! ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

تذکروں کا تذکرہ نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۶۴ء

جس نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کیا ہے کہ

تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے؟

اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں؟

تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا؟

اردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں؟

ان تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے؟

ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے؟

ان سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے؟

ان تذکروں میں اردو فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے؟

یہ خزانہ ادب کے تاریخی۔ تحقیقی۔ سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے۔؟

ضخامت:- ۳۵۲ صفحات — قیمت:- چار روپے

نگارِ پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی نمبر ۳

میری نعتیہ غزل

(ماہر القادری)

مجلّہ "نگارِ پاکستان" کے فروری ۱۹۶۵ء کے شمارے میں جناب سید محمد باقر شمسؔ لکھنوی نے میری ایک نعتیہ غزل پر تبصرہ فرمایا ہے، داد و تحسین کے ہجوم میں اس قسم کا احتساب بھی ضروری ہے تاکہ کبرِ نفس کا ازالہ ہوتا رہے! اور اپنی کوتاہی اور ناتمامی کا احساس چونکاتا رہے! غلطیاں کس ادیب و شاعر سے نہیں ہوتیں، نبیوں اور رسولوں کے علاوہ کوئی انسان معصوم نہیں ہے، صحیح تنقید واقعی احتساب اور معقول گرفت ہو تو تنقید نگار کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ مجھ سے بھی شعر و ادب میں زبان و بیان کی غلطیاں ہوئی ہیں، شمسؔ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ان کی تنقید و احتساب نے مجھے چونکا دیا۔

میرے کلام کے چار مجموعے (محسوساتِ ماہرؔ، نغماتِ ماہرؔ، جذباتِ ماہرؔ اور ذکرِ جمیل) ہندوستان میں اب سے تقریباً پچیس ۲۵ سال پہلے شائع ہوئے تھے اور پانچواں مجموعہ "فردوس" یہاں پاکستان میں چھپا ہے۔ میں اپنے تمام مطبوعہ کلام پر نظرِ ثانی کر کے ایک مجلد میں یکجا کر رہا ہوں۔ "ذکرِ جمیل" علیحدہ شائع ہوگا جس پر نظرِ ثانی کر چکا ہوں! اپنے اس انتخاب پر میں خود پیش لفظ لکھوں گا، جس میں بتاؤں گا کہ میں نے جن اشعار کو حذف کر دیا ہے ان میں کیا اسقام اور کمزوریاں تھیں ماہ فروری کے "فاران" میں میرا یہ اعلان آچکا ہے۔

میری یہ نعت جس پر "نگار" میں تنقید شائع ہوئی ہے، اس کے آٹھ اشعار میں نے نظرِ ثانی میں حذف کر دئے ہیں اور ایک شعر میں چند لفظ تبدیل کر کے مصرعہ کو چست کر دیا ہے، اپنے اس نعتیہ مجموعہ کلام پر نظرِ ثانی کا کام میں ماہ جنوری ۱۹۶۵ء کے آخر میں ختم کر چکا تھا، جب تک "نگارِ پاکستان" میں شمسؔ صاحب کی تنقید نہیں آئی تھی۔

اپنے کلام پر وارد کئے ہوئے اعتراضات کو رفع کرنا اور اپنی مدافعت میں کچھ لکھنا بڑا دشوار کام ہے۔ ہر آن خودستائی کا خطرہ لگا ہوا۔ میں ڈرتے ڈرتے یہ مضمون لکھ رہا ہوں، یہ نہایت ناخوشگوار فرض ہے۔ جسے انجام دینے کی نوبت آرہی ہے۔ مگر کیا کیا جائے اس دنیا میں بہت سی خلافِ طبیعت باتیں بھی گوارا اور انگیز کرنی پڑتی ہیں۔

فاضل تنقید نگار نے جن باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نعتِ رسولؐ میں ان کو نہ ہونا چاہیئے اللہ تعالےٰ کے فضل سے بدوِ شعور ہی سے ان تمام باتوں سے میں نے نعت میں اجتناب کیا ہے۔ صنم، بُت، کافر، ستمگر، قاتل اس قسم کا کوئی لفظ میں نے نعت میں نظم نہیں کیا، اور نہ عاشقانہ زبان میں وصال کی تمنا اور ہجر کی شکایت کی! میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس نگاہ کو "دزدیدہ" کہنا بھی پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ مدینہ طیبہ کی بجائے "یثرب"

کا استعمال بھی مجھے طبعاً پسند نہیں ہے، اور وہ اس لئے کہ حضورؐ نے اس بستی کے قدیم نام "یثرب" کو "مدینہ" اور "طیبہ" سے بدل دیا تھا۔ فاضل تنقید نگار نے نعت گوئی کے سلسلے میں جن "احتیاطوں" کا ذکر فرمایا ہے، ان کا اطلاق میرے نعتیہ کلام پر نہیں ہوتا کہ میں بحمد اللہ پہلے ہی سے اس باب میں محتاط ہوں، لہٰذا ان کے مضمون کا یہ حصہ نفس تنقید سے غیر متعلق ہی سمجھا جائے گا۔ شمس صاحب فرماتے ہیں :-

"نعت کے لئے نہ شوکتِ الفاظ درکار ہے، نہ تشبیہات و استعارات نہ وہ مبالغہ کی متحمل ہو سکتی ہے، نہ تعبیرات کی ندرت و بدعت کی، نہ وہ خیال آرائی ہے نہ معنی آفرینی بلکہ محض صداقتِ جذبات، خلوص عقیدت، والہانہ انداز بیان اور جذبہ فدویت و جاں نثاری مثلاً شہیدی کا یہ شعر

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی، اگر تو کسی قابل ہوتا

یا حسرت کا یہ شعر ؎

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب آن پہونچے ہیں مگر منزل جاناں کے قریب"

جناب شمس صاحب نے عجیب باتیں کہی ہیں۔ "نعت" شعر و سخن ہی کی ایک صنف ہے اور جو شاعری شوکتِ الفاظ، تشبیہات و استعارات، تعبیرات کی ندرت اور معنی آفرینی سے عاری ہوگی وہ شاعری کس قدر خشک، سطحی اور بے کیف ہوگی۔ شمس صاحب کیا یہ چاہتے ہیں کہ نعتیہ غزلیں اور نظمیں نری سپاٹ اور یکسر بے مزہ ہوا کریں، یعنی ان میں نہ تو شوکت الفاظ ہو نہ معنی آفرینی! جب تک شاعری کے لوازم اور ضروری عناصر یکجا نہ ہوں گے، محض صداقتِ جذبات اور خلوص عقیدت کو "دندانِ تو جملہ در دہانند" کے انداز پر شعر میں نظم کر دینے سے وہ "نعت" تو وجود میں نہیں آسکتی، جس کو اہل نظر اور صاحبانِ ذوق "عظیم" کہہ سکیں۔ صداقت جذبات اور خلوص عقیدت کا اظہار حسین و دلکش انداز میں ہو تو "پیکر جمیل در لباس حریر" کا اطلاق نعتیہ نظم پر ہو سکتا ہے، جناب اقبال سہیل مشہور نعت گو شاعر گزرے ہیں، وہ کہتے ہیں۔

محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستیں کلک قدرت کا محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعات ربانی

تراشہ جس کے ناخن کا ہلال آسماں منزل غسالہ جس کے تلووں کا زلال آب حیوانی

وہ رابط عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے وہ تارک زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی

علامہ اقبال کے دو نعتیہ شعر ہیں ؎

وہ دانائے سُبل، ختم رسل، مولائے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادیِ سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآں وہی فرقاں، وہی یٰسٓ وہی طٰہٰ

حضرت محسن کاکوروی براق رسول کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

مہ پارہ فلک سے آنے والا اطلس کو کتاں بنانے والا

ان شعروں میں شوکت الفاظ بھی ہے تشبیہ و استعارہ بھی ہے۔ معنی آفرینی اور ندرتِ خیال بھی ہے۔ کیا شمس لکھنوی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ نعت کہنے والے اس انداز پر مصرعے جوڑا کریں ۔۔ کہ۔

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے تیری گائے بنائی

سب سے زیادہ حیرت تو اس پر ہوئی کہ شمس صاحب شہیدی کے حمد باری تعالٰے کے شعر کو نعتیہ شعر سمجھ بیٹھے،

شہیدی کا یہ شعر ؎

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر　　تجھ سے کیا ضد تھی، اگر تو کسی قابل ہوتا

پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں "حمد" کا شعر ہوں، جس کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں!

حسرت موہانی کا یہ شعر ؎

ایک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب　　آن پہونچے ہیں مگر منزل جاناں کے قریب

"عاشقانہ" ہے! حیرت ہے کہ تنقید نگار کو اس میں "منزلِ جاناں" نہیں کھٹکا کہ نعت میں انھوں نے جس شدتِ احتیاط کا ذکر کیا ہے، اس کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا "جاناں" کہا جا سکتا ہے!

تنقید نگار کو میری اس کتاب "ذکرِ جمیل" کے نام ہی میں سقم نظر آیا جس کا اظہار وہ یوں فرماتے ہیں۔

"سب سے پہلے تو میں اس مجموعہ کا نام ہی دیکھ کر کھٹکا کہ اس کو ذکرِ جمیل کا عنوان کیوں دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ "ذکرِ جمیل" کی ترکیب اضافی ہو سکتی ہے یا توصیفی! اگر اضافی ہے تو اس کے معنی ہوں گے کسی "جمیل کا ذکر" اور رسول اللہ کو جمیل کے نام سے موسوم کرنا بڑی گری ہوئی بات ہے۔ لیکن اگر یہ ترکیب توصیفی ہے، تو اس کے معنی ہوں گے کہ اس کتاب کا موضوع جمیل ہے، لیکن موضوع کے جمیل ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر اس کی پیش کش واقعی جمیل نہ ہو۔۔۔"

میری کتاب کا نام ۔۔۔ ذکرِ جمیل ۔۔۔ ترکیب اضافی اور ترکیب توصیفی ہر اعتبار سے صحیح ہے اور اس میں ذرا سا بھی کوئی سقم تو کیا گنجائش اشتباہ تک نہیں ہے! یعنی یہ کہ اُس ہستی کا ذکر جو "جمیل" ہے! شمس لکھنوی کا یہ فرمانا کہ رسول اللہ کو "جمیل" کے نام سے موسوم کرنا بڑی گری ہوئی بات ہے ۔۔۔ فن تنقید اور علم و دانش کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے۔ کیا انھوں نے یہ مشہور حدیث نہیں سُنی۔

"اللہ جمیلٌ ویحبّ الجمال" (اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے)

کیا نطقِ رسولؐ سے اللہ تعالیٰ کی صفت میں کوئی گری ہوئی بات نکل سکتی ہے!؟ بے سوچے سمجھے جھٹ سے اعتراض جڑ دینے کی عادت معترض کو شرمندہ کر کے چھوڑتی ہے! راقم الحروف کی اس گزارش پر شاید کوئی صاحب یہ اعتراض وارد کر دیں کہ جو صفاتی نام اللہ کے لئے استعمال ہوا ہے وہ رسولؐ کیلئے استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ مگر یہ اعتراض بھی سرسری اعتراض ہو گا۔ جمیل، رؤف اور رحیم وغیرہ وہ صفاتی نام ہیں جو اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ دونوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس لئے۔ "ذکرِ جمیل" کی ترکیب اضافی معنی و بیان اور واقعہ کے اعتبار سے" درست ہے اب رہی، ترکیب توصیفی" تو اس کا بیشک یہی مفہوم ہے کہ جس فرد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح و نعت میں یہ کلام کہا گیا ہے۔ اس کا خود ذکر بھی اپنی جگہ "جمیل" ہے۔ میں نے اپنی کتاب کے نام ۔۔۔ ذکرِ جمیل ۔۔۔ میں اپنے کلام کی تعریف نہیں کی کہ میرا کلام حسین و جمیل ہے بلکہ اس میں ممدوح کے نفس ذکر کو "جمیل" کہا گیا ہے۔ بہر حال "جمیل" کی نسبت چاہے وہ حضور کی ذات سے ہو یا ذکر سے کسی لحاظ سے بھی محلِ نظر نہیں ہے! نعت کا مشہور شعر ہے۔

یا صاحب الجمال و یا سید البشر　　من وجہک المنیر لقد نور القمر

تمہید کے بعد فاضل ناقد نے میری نعت کے اشعار پر نقد و احتساب فرمایا ہے ؎

حُسن کی جاں ایمانِ محبت صلی اللہ علیہ وسلم — سرتاپا رحمت ہی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض: اس میں شک نہیں کہ آں حضرت قبول صورت انسان تھے۔ لیکن آپ کے ظاہری حُسن میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی کہ اسے صفتِ اولین قرار دے کر "جان حُسن" سے خطاب کیا جائے آنحضرت کے زمانہ حیات میں جو صحابہ آپ سے قریب تر اور محبت کا دم بھرنے والے تھے۔ ان میں سے کسی نے ان کی شان میں کوئی ایسا نقرہ نہیں کہا۔ صرف حضرت ابوذر غفاری کو بے شک یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ رسول اللہ کو میرے حبیب کہا کرتے تھے۔ لیکن دوسرے صحابہ کو اتنی جرأت بھی نہ تھی، اس لئے آپ کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرنا، جو دنیاوی معشوق کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، بڑی نامناسب بات ہے۔ علاوہ اس کے "ایمانِ محبت" بالکل بے معنی فقرہ ہے دوسرا مصرع بھی اپنی بندش کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔ نہ اس میں کوئی شاعرانہ لطف ہے نہ موسیقیت، یہ شعر اگر اس طرح نظم کیا جاتا، تو مناسب تھا۔

خلق کے پیکر جان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

رحمتِ عالم، عالم رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

جواب: ایک طرف تو شمس لکھنوی مداحت نعت میں خلوص عقیدت، صداقت جذبات، والہانہ انداز بیان اور جذبہ فدویت و جاں نثاری کی تلقین کرتے ہیں اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری حسن کے بارے یہ اُن کی یہ رائے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس ایک قبول صورت انسان تھے۔ حضور کے ظاہری حسن میں کوئی خصوصیت نہ تھی، ایسی بلندی، ایسی پستی:۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

کیا شمس لکھنوی نے "شمائل ترمذی" کا مطالعہ نہیں کیا، اس میں صحابہ کرام ہی کی روایتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حلیہ مبارک بیان کیا گیا ہے وہ "حسین ترین" انسان کی شکل و شباہت پر دلالت کرتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے جو احادیث و آثار کی کتابوں میں منقول ہے کہ ایک صحابی نے چودھویں رات کے چاند اور رسول اللہ کے چہرہ مبارک کا مشاہدہ اور موازنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ خدا کی قسم رسول اللہ کا چہرہ بدر کامل سے زیادہ حسین اور تابناک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس چہرے کی جلالتِ عتاب کو ایک صحابی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ گویا "کسی نے سُرخ انار نچوڑ دیا ہے" اس پر اُمت کا ہر دور میں اجماع رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے روحانی کمالات کے ساتھ رسول اللہ کو بے مثال ظاہری حُسن بھی عطا فرمایا تھا، تمام شعرا نے آپ کے حسن و جمال کی تعریفیں کی ہیں اور حضور کا "سراپا" بیان کیا ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے آپ کے حسن و جمال کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

"...... ما رایت شیئاً قط احسن منہ"

(میں نے آپ (رسول اللہ) سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابیض کانما صیغ من فضۃٍ رجل الشعر

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے سپید تھے گویا کہ چاندی سے آپ کا بدن مبارک ڈھالا گیا ہے آپ کے موئے مبارک قدرے خمدار گھونگریالے تھے)

صحابہ کرام کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شکل و شباہت اور حسن و جمال کے بارے میں یہ تاثرات! مگر شمس لکھنوی کہتے ہیں کہ حضور کے ظاہری "حسن میں کوئی ایسی خصوصیت ہی نہ تھی"۔! آخر ان میں سے کس کو سچا مانیں ان صحابہ کو جنھوں نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کی سعادت حاصل کی تھی یا شمس لکھنوی کو جنھوں نے رسول اللہ کے شمایل کسی کتاب میں کبھی نہیں پڑھے۔ اگر وہ پڑھ لیتے تو ایسی بات کبھی نہ کہتے۔

دنیا کی ساری رونق اور گہما گہمی دو ہی چیزوں سے ہے، حسن سے اور محبت سے، میں نے اپنے شعر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانِ حسن اور ایمانِ محبت کہہ کر معاذ اللہ کوئی ایسی بات نہیں کہی۔ جس میں ذم کا کوئی شبہہ بھی پایا جاتا ہو! شعر و ادب میں بہت سے ایسے الفاظ، محاورے اور استعارے ہیں جو اللہ رسول اور انسانوں کے لئے ایک ہی طرح استعمال ہوتے ہیں اب رہا میرا شعر اُس میں فاضل ناقد کو کوئی شاعرانہ لطف محسوس نہیں ہوتا تو میں ان کے اس احساس کی تردید نہیں کرتا کہ ــــ

یہ اپنے اپنے ذوق و طبیعت کی بات ہے

میرے جس دوسرے شعر پر اعتراض کیا ہے۔ اسے میں ان کی تنقید سے پہلے ہی اپنی غزل سے چھانٹ چکا ہوں۔

بدر و خندق میں خود آ کر کفر کو دیں ہر بار شکستیں
مالکِ سطوت، صاحبِ شوکت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:- بدر و خندق کے واؤ عطف کو کھینچ کر پڑھنے سے مصرع موزوں ہوتا ہے، اور مصرعہ "بدرو" سے شروع ہوتا ہے، جو نفاستِ ذوق کے منافی ہے۔ علاوہ اس کے بدر و خندق کی تاریخی ترتیب بھی غلط ہے، اس کو "بدر و احد" ہونا چاہیئے، "خود جا کر کو خود آ کر" کہنا بھی درست نہیں، ہر بار کے ساتھ "شکست" (واحد) ہونا چاہیئے، نہ کہ جمع! مالک سطوت و شوکت کہنا بھی شانِ رسالت کے منافی ہے، شعر یوں درست ہو سکتا ہے ؎

بدر و احد میں خود جا کر، ہر بار ہزیمت کفر کو دی
ساتھ تھی ہر جا حق کی حمایت صلی اللہ علیہ وسلم

جواب:- شعر میں واؤ عطف کا اس طرح کھینچ کر پڑھا جانا نہ صرف جائز بلکہ درست ہے، اور کسی شاعر کا کلام اس سے خالی نہیں ہے۔ مرزا بیدلؔ فرماتے ہیں۔

سحر آہ و گلستاں، نکہت و بلبل فغاں دارد
جہانے سوئے بیرنگی ز حسرت کارواں دارد

پڑھتے ہیں اور تقطیع میں "سحر آہو" "ہتو بلبل" آتا ہے۔

اگر اس پر بھی یہ اعتراض وارد کیا جائے کہ مصرعہ کا آغاز اس طرح نہ ہونا چاہیئے، جس طرح میرے شعر پر اعتراض وارد کیا گیا ہے ــ کہ یہ مصرع "بدرو" سے شروع ہوتا ہے۔ تو اس کے جواب میں مرزا بیدل کا ایک اور شعر حاضر ہے۔

من دسانِ دُکانِ خود فروشیہا چہ صرف است ایں

جنونِ این فضولی در سر منصور می باشد

اس شعر کا آغاز " منو " سے ہوتا ہے ! اسی طرح غالب کی غزل کا مقطع ہے۔

وحشت وشیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

یہ شعر بھی " وحشتو " سے شروع ہوتا ہے !۔

اب رہی تاریخی ترتیب تو یہ قطعاً ضروری نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عام طور پر " فاتح بدر و خیبر" کہا جاتا ہے اس میں بھی تاریخی ترتیب نہیں ہے، تاریخی ترتیب (یعنی بدر و خندق کی جگہ بدر و احد) نہ ہونے سے شعر میں کسی قسم کا معنوی سقم پیدا نہیں ہوتا! "شکستیں" بصورت جمع درست ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر معرکہ میں شکست پر شکست دی گئی اور کافروں کو دم لینے نہیں دیا گیا۔ "خود جاکر" کے مقابلہ میں " خود آکر " کا انداز بیان زیادہ زوردار ہے، شوکت اور سطوت آخر شانِ رسالت کے منافی کس طرح ہوئیں! کوئی دلیل، کوئی قرینہ؟ یہ کیا کہ اعتراض ذہن میں آتے ہی سپرد قرطاس کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے رعب[1] ۔ دبدبہ اور شوکت اور سطوت تمام انبیاء سے بڑھ چڑھ کر عطا فرمائی تھی۔

فخر امم، غمخوار اُمت، صاحبِ عظمت، حامل قرآں فرق پہ جن کے تاج شفاعت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ " فخر اُمم" کہنا غلط تعبیر ہے۔ فخر امم تو دراصل ان کی اُمت ہے، وہ فخر رسل تھے، پہلے مصرع کے باقی ٹکڑے بے جوڑ ہیں۔

جواب:۔ امت محمدیہ کو فخر امم نہیں خیر الامم کہا جاتا ہے۔ یعنی تمام امتوں میں سب سے بہتر امت! تمام اُمتوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا " باعث فخر" یعنی فخر امم ہونا، اس میں آخر تعبیر کی غلطی کہاں سے پیدا ہوگئی!

خندق میں سلمانؓ نے دیکھا، ان کے لطف و عطا کا جلوہ

کھول دئے ابواب حکومت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ حاشیہ پر لکھا ہے، غزوۂ خندق کی تلمیح: حالانکہ جنگِ خندق میں آنحضرت کے لطف و عطا کا کوئی واقعہ حضرت سلمانؓ سے مخصوص نہیں، حکومت کے دروازے کھولنا بھی کوئی پسندیدہ اندازِ بیان نہیں۔

جواب:۔ اس تاریخی واقعہ کا تعلق غزوۂ خندق ہی سے ہے کہ خندق کھودنے میں جب ایک سخت چٹان آگئی۔ جو صحابہ کرام سے کسی طرح ٹوٹتی نہ تھی، تو حضور نے کُدال ہاتھ میں لے کر اُس چٹان پر ضرب لگائی۔ پہلی ضرب میں ایک روشنی نمودار ہوئی۔ جس میں حضرت سلمانؓ نے شام کے محلوں کو دیکھا، دوسری ضرب میں چمک ہوئی تو اس اُجالے میں سلمانؓ نے کسریٰ کے محل کا مشاہدہ کیا، یہ اس طرف اشارہ تھا کہ امت محمدیہ ان حکومتوں پر تسلط اور غلبہ پائے گی! اس طرح گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی فتح و نصرت کے لئے حکومتوں کے دروازے کھول دئے! دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر شاعرانہ اور ادیبانہ انداز بیان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ واقعہ کی نوعیت کچھ ایسی معجزانہ ہے کہ حضور نے آنے والے خوشحالات کی جھلکیاں دکھا کر مسلمانوں کو ان حکومتوں کی گویا کنجیاں دے دیں، اس واقعہ کو میں نے " لطف و عطا کے جلوے " سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] متفق علیہ حدیث میں ہے ۔ ثال بعثت بجوامع الکلم و نصرت بالرعب ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ " رعب " سے میری مدد کی گئی ہے۔

(۶) :- بندے اور اللہ میں رکھا ہر عالم میں فرقِ مراتب
شرک کے دشمن ، ماحیٔ بدعت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض :- پہلا مصرع بالکل بے معنی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماہر صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں اور فرقِ مراتب سے کیا مراد ہے! دوسرے مصرع میں رسول اللہ کو ماحیٔ بدعت کہنا عجیب سی بات ہے - جب کہ بدعت کی اصطلاح رسول اللہ کے بعد کی چیز ہے -

جواب :- پہلا مصرع بالکل صاف اور واضح ہے - یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید خالص کا اس طرح عملاً درس دیا کہ بندے اور اللہ کے فرق کو ہر عالم میں باقی رکھا ، حلول و اتحاد ، انا الحق اور من تو شدم "تو من شدی" کے نکات و رموز بیان نہیں فرمائے - یہ بات تو شمس صاحب نے عجیب ترکہی ہے کہ بدعت کی اصطلاح رسول اللہ کے بعد کی چیز ہے - حالانکہ یہ حدیث امت میں شہرت عام کی حیثیت رکھتی ہے - حضورؐ فرماتے ہیں :-

کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار

گزشتہ امتوں نے یہی تو کیا تھا کہ اللہ کے دین و شریعت میں طرح طرح کی مشرکانہ رسمیں اور بدعتیں نکال لی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مٹا دیا اور "توحید خالص" کو پیش فرمایا -

نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اتباع میں جو " محمداً عبدہٗ و رسولہٗ " پڑھتے ہیں ، یہ بندہ اور اللہ کے درمیان "فرقِ مراتب" قائم رکھنے کی واضح مثال ہے[1] - فارسی کا مشہور مصرع ہے -

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی !

(۷) :- فرمایا تم قبر کو میری سجدہ گہ ہرگز نہ بنانا
اللہ اللہ پاسِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض :- بڑا ملایانہ اور بے مزہ شعر ہے - پاسِ شریعت کے سلسلہ میں سب سے بڑا کارنامہ رسول اللہ کا ماہر صاحب کے نزدیک شاید یہی تھا -

جواب :- مصرع اولیٰ میں رسول اللہ کی حدیث کی ترجمانی کی گئی ہے - جس میں فاضل ناقد کو ملائیت دکھائی دیتی ہے ! یہ اس شعر سے کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاسِ شریعت کے سلسلہ میں سب سے بڑا کارنامہ شاید یہی تھا! کسی ایک ایک وصف کے نثر و نظم میں ذکر کر دینے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ جس وصف کا ذکر کیا گیا ہے وہی ممدوح کا سب سے بڑا کارنامہ ہے !

آٹھواں اور نواں شعر ———— جن پر اعتراض وارد کئے گئے ہیں ، انھیں میں نے نظر ثانی میں پہلے ہی حذف کر دیا ہے -

(۱۰) :- سنجیدہ سنجیدہ ادائیں ، شرمیلی شرمیلی نگاہیں
فخرِ حیا نازِ غیرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا -
انی لا اُرید ان ترفعنی فوق منزلتی التی انزلنیھا اللہ تعالیٰ انا محمد بن عبد اللہ عبدہٗ و رسولہٗ
(بیشک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤ تم مجھ کو اس رتبے سے زیادہ جو اللہ نے مجھے بخشا ہے ، میں تو وہی محمد ہوں بیٹا عبد اللہ کا اللہ کا بندہ اور اس کا رسول)

اعتراض:- شرمیلی نگاہوں کے ساتھ ادا، ناز، حیا کا ذکر کسی عورت کے حق میں تو موزوں ہو سکتا ہے مگر پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی ہے۔ پہلا مصرع غیر موزوں ہے!

جواب:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "شمائل و عادات اور خصائل" میں ملتا ہے اور صحابیٔ رسول اس کے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔

"عن ابی سعید ن الخدری قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد حیاءً من العذراء فی خدرھا۔۔۔۔"

(ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرم و حیا میں کنواری لڑکی سے جو پردے میں ہو، کہیں زیادہ بڑھے ہوئے تھے)

میں نے اسی حدیث کو ذہن میں رکھ کر یا اس کو پس منظر قرار دے کر حضور کی نگاہوں کو "شرمیلی" کہا ہے! "حیا" کا ذکر کسی عنوان سے بھی بارگاہ رسالت میں گستاخی یا سوء ادب نہیں ہے۔ جب کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا کو ایمان کی شاخ (الحیاء شعبۃ من الایمان) فرمایا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا لقب "صاحب الحیاء" بہت مشہور ہے اور اس لقب سے کسی نے بھی گستاخی اور ذم کو منسوب نہیں کیا۔ "اداؤں" کا لفظ جس انداز میں اس مصرع میں استعمال ہوا ہے اس میں ذم یا گستاخی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور "سنجیدہ اداؤں" سے تو اس مفہوم کی ترجمانی ہوتی ہے کہ عام طور پر حسینوں اور خوبروؤں کی ادائیں شوخ ہوتی ہیں مگر حضور کی "ادائیں سنجیدہ" تھیں۔ سیرت کی طرح صورت بھی مقدس و باوقار!

اس شعر میں "نازِ غیرت" سے یہ مراد ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیوی حسینوں کی طرح (معاذ اللہ) ناز و انداز دکھاتے تھے۔ بلکہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ حضور اس قدر غیور تھے کہ خود "غیرت" آپ پر فخر و ناز کرتی تھی۔

"ذکر جمیل" کا دوسرا ایڈیشن میرے پاس موجود ہے۔ اسے ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔ میرا یہ شعر اس میں یوں لکھا ہے۔

سنجیدہ سنجیدہ ادائیں، شرمیلی شرمیلی نگاہیں\
فخرِ حیا اور نازِ غیرت صلی اللہ علیہ وسلم

اس شعر پر "ناموزوں" ہونے کا الزام کون لگا سکتا ہے؟ فاضل ناقد نے جو میرا شعر لکھا ہے۔ اُس کے دوسرے مصرع میں "اور" چھوڑ دیا ہے۔ "ذکر جمیل" کا پہلا ایڈیشن میرے پاس نہیں ہے۔ اگر اس میں "اور" کاتب نے نہیں لکھا تو تنقید نگار کو خود ہی سوچنا چاہیے تھا کہ اتنی معروف بحر میں کوئی شاعر ناموزوں شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔

(۱۱):- ماتھا ان کا نور کا تڑکا، زلفوں میں رحمت کا سویرا\
لب پہ تبسم صبح سعادت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:- اگر ماتھے میں "نور کا تڑکا" کہا جاتا تو البتہ گیسو میں رحمت کی گھٹا کا تقابل درست ہو سکتا تھا لیکن جب ماتھے کو نور کا تڑکا کہا ہے تو گیسو کو رحمت کی گھٹا کہنا چاہیے، گیسو میں گھٹا کوئی پر لطف بات نہیں!

جواب:- یوں کہنے سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماتھا نور کا تڑکا تھا، اور آپ کے گیسوؤں میں رحمت کی گھٹائیں (غلطاں یا آسودہ) تھیں تقابل کے لطف میں کیا کمی آگئی! "غلطاں یا آسودہ" یہ الفاظ مصرع میں مقدر ہیں۔

سب سے اونچا درجہ ان کا، حق نے بخشا ایسا رتبہ\
جس کی نہیں کوئی بھی نہایت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ دوسرے مصرع میں لفظ "بھی" زائد ہے! محض وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

جواب:۔ کیا "بھی" سے شعر میں Force پیدا نہیں ہوگیا؟

۱۳۔ دین و دنیا یکجا کر کے راز ترقی کے سمجھائے
یہ بھی رحمت وہ بھی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ دوسرے مصرعہ میں یہ بھی وہ بھی کہنے کا موقع نہ تھا، دین و دنیا الگ الگ سہی، لیکن جب ان کو ملاکر راز ترقی کا سمجھایا تو یہ تفریق ختم ہوگئی۔

جواب:۔ اس شعر میں دراصل ترک دنیا اور رہبانیت کے عقیدہ کی نفی کی گئی ہے کہ یہ دونوں اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں اور دنیا دین کے تابع ہو تو وہ نفرت کرنے کی چیز نہیں ہے۔ دین و دنیا کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئے اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں، اس صورت میں "یہ بھی" اور "وہ بھی" لانا ضروری تھا! "الدنیا مزرع الاخرہ" کے عقیدے کے باوجود دین و دنیا بالکل ایک تو نہیں ہو جاتے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "تابیر نخلہ" کے واقعہ کے سلسلہ میں صحابہ کرام سے فرمایا کہ۔

"دنیا کی باتیں تم بہتر جانتے ہو۔"

چودھواں شعر جس پر تنقید فرمائی گئی ہے، "کمزور ہے" جسے میں نظر ثانی میں پہلے ہی چھانٹ چکا ہوں۔

۱۵۔ مشرق میں ان کا فرمان ہے جاری، مغرب بھی ان کے در کا بھکاری
عام ہوا پیغام ہدایت　صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ یہ نظم بحر متقارب اثرم میں لکھی گئی ہے مگر پہلے مصرعہ میں "فرمان" کا نون غنہ غائب ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا اعلان ہونا چاہئے، اس لئے "ہے" غیر ضروری ہے..... معنی و حقیقت کے لحاظ سے بھی یہ مصرعہ غلط اور خلاف حقیقت ہے۔

جواب:۔ "ذکر جمیل" یعنی میری کتاب میں یہ شعر یوں درج ہے۔

شرق میں ان کا فرماں جاری، غرب بھی ان کے در کا بھکاری
عام ہوا پیغام ہدایت صلی اللہ علیہ وسلم　　(صفحہ ۲۷)

اس شعر میں عروض، بحر اور وزن کے اعتبار سے ذرا سی بھی غلطی اور کسی قسم کی کور کسر نہیں پائی جاتی۔ معنی و حقیقت کے لحاظ سے مصرعہ اولیٰ بالکل صحیح ہے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ شرق (مشرق) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جاری ہے، یعنی آپ کا دین بہت سے مشرقی ملکوں میں پایا جاتا ہے اور کروڑوں انسان آپ کے حلقہ بگوش ہیں اور مغرب بھی ہدایت حاصل کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محتاج اور دریوزہ گر ہے۔

۱۶۔ وہ جو نہ ہوتے، کچھ بھی نہ ہوتا، دنیا ان سے، عقبیٰ اُن سے
دونوں جگ ہیں ان کی بدولت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ اس شعر میں تکرار بے لطف ہے "وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا" اس کو دوسری طرح یوں کہا ہے۔

"دنیا ان سے عقبیٰ ان سے" اس اصلاح سے غالباً یہ شعر بہتر ہو سکتا ہے۔

مزرع دنیا، گلشن عقبیٰ دونوں شاداب ان کے قدم سے
تابش قدرت، بارش رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

جواب:۔ میں جس مفہوم کو شعر میں ادا کرنا چاہتا ہوں وہ ناقد صاحب کے عطا کئے ہوئے شعر میں کہاں باقی رہا۔ پھر اس میں "تابشِ قدرت" محل نظر ہے۔ "جلوۂ قدرت" تو کہتے ہیں مگر "تابشِ قدرت" مانوس ترکیب نہیں ہے۔ اگر میرے بجائے یہ شعر کسی دوسرے شاعر کا ہوتا تو اس کے لفظ و معنیٰ کی سادگی ...... وغیرہ کو نمایاں کرتا۔ اپنے منھ اپنے شعر کی کیا تعریف کروں۔

۱۷۔ ان کا گر اقرار نہ ہوگا، تکمیل توحید نہ ہوگی
عین ایماں، ان کی الفت۔ صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ اقرارِ نبوت سے توحید کا کوئی واسطہ نہیں، دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں، توحید کی جگہ اسلام کہنا مناسب تھا۔

جواب:۔ بعض لوگ جو "وحدت ادیان" کے قائل ہیں وہ نبیٔ آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کو آخری شریعت تسلیم کرنا ضروری خیال نہیں کرتے۔ میں نے اپنے شعر میں اس عقیدے کی نفی کی ہے اور بتایا ہے کہ محض "لا الٰہ الا اللہ" کہنا کافی نہیں ہے۔ جب تک محمد رسول اللہ کا اقرار نہ ہوگا "لا الٰہ الا اللہ" یعنی توحید پر ایمان لانا ادھورا اور نامکمل رہے گا۔ اقرارِ رسالت کے بغیر "توحید" پر ایمان ناقص ہی سمجھا جائے گا۔

اٹھارویں اور انیسویں دونوں شعر جن پر گرفت کی گئی ہے۔ میں نے خود ہی حذف کر دئے ہیں۔

۲۰۔ رات کی تنہائی میں نمازیں، بخششِ اُمت کی دُعائیں
جن کے سجدے فخرِ عبادت۔ صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ پہلا مصرع ناقص الوزن ہے، دوسرے مصرع میں "جن" کا مرجع غلط ہے، یوں لکھنا چاہیے تھا۔

رات کی تنہائی میں کبھی، اور دشت کی تنہائی میں کبھی
خاک پہ سجدے جانِ عبادت صلی اللہ علیہ وسلم

جواب:۔ "ذکر جمیل (طبع دوم) میں یہ مصرعہ اس طرح مکتوب و مرقوم ہے۔

ع رات کی تنہائی میں نمازیں، امت کی بخشش کی دُعائیں

اور اس میں وزن، بحر اور تقطیع کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ "جن" کا مرجع آخر کس قاعدے سے غلط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و نعت بیان کی جارہی ہے "جن" کا مرجع حضورؐ ہی کی ذاتِ گرامی ہے! تنقید نگار صاحب نے جو شعر عنایت فرمایا ہے، وہ نومشقوں کے کہنے کا ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں "کبھی" کی تکرار ہی بھلی نہیں لگتی۔ پھر رات کی تنہائی کے مقابلہ میں دن کی جلوت لاتے تو ایک بات بھی تھی، کہ حضور جلوت و خلوت میں اللہ تعالےٰ کی عبادت کیا کرتے تھے: جانِ عبادت کے مقابلہ میں "نازِ عبادت" میں زیادہ قوت تاثیر اور شعریت پائی جاتی ہے، یعنی ایسے سجدے جن پر خود عبادت ناز کرتی تھی۔

۲۱۔ سائل کو ناکام نہ پھیرا، بخش دیا جو کچھ گھر میں تھا
بھوکے سو رہنے کی عادت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا۔ دوسرے مصرعہ سے بالکل بے تعلق ہے۔ اگر عادت کی جگہ عادی ہوتا تو البتہ ...... صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہو سکتا تھا۔

جواب:۔ میں نے سیرت مقدسہ کے اس رخ کو پیش کیا ہے کہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ حریم نبوت میں تھوڑے سے جو،

ستو یا کھجور ہیں، سائل آیا، حضور نے وہ اس کو عطا کر دئے، اور خود بھوکے سو رہے! فاضل ناقد کا یہ عجیب اعتراض راقم الحروف کے تو پلے نہیں پڑا کہ "عادت" کی جگہ "عادی" ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہو سکتا تھا! نہ جانے وہ کیا کہنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔

۲۲۔ اپنی بیٹی کے سر پر تھا، ایک دوپٹہ وہ بھی شکستہ
بانٹ رہے تھے سب کو دولت صلی اللہ علیہ وسلم

اعتراض:۔ اس شعر میں اپنی کا لفظ بالکل غیر ضروری ہے۔ بلکہ منافی فصاحت ہے۔ پہلا مصرعہ اس طرح نظم کرنا چاہئے تھا۔ ع

بیٹی کے سر پہ ایک دوپٹہ، وہ بھی کہنہ اور بوسیدہ

جواب:۔ "اپنی" نہ غیر ضروری ہے اور نہ منافی فصاحت ہے "اپنی" سے تو شعر میں اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ اُردو زبان کی چند مثالیں:۔

"حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کی گردن پر چھری چلادی۔"
"مجسٹریٹ نے اپنی بیٹی کی سفارش کو رد کر دیا۔"
"اس کے اپنے بھائی کے بدن پر پھٹے پرانے کپڑے تھے۔"

یہ تنقید مندرجہ ذیل عبارت پر ختم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلہ میں ایک بات اور مجھے یاد آگئی، وہ یہ کہ ماہر صاحب نے بارہا اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ شاعری میں اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ انبیاء کے حق میں تحقیری الفاظ استعمال کئے جائیں۔ مثلاً تجلی طور کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ سے طنز آمیز خطاب کرنا، یا معشوق کی تعریف میں حضرت یوسفؑ کے حسن پر طعن کرنا، یا محبوب کے لب جاں بخش کے بیان میں حضرت عیسیٰ کے معجزہ احیاء موتیٰ کی تخفیف کرنا، اور اس میں شک نہیں، انتہائے تقدس کا یہی تقاضا ہے، لیکن مجھے حیرت ہے کہ ایک دن ...... ماہر صاحب کا یہ نعتیہ شعر ریڈیو پر سُنا ؎

تھا مسجدِ اقصیٰ میں جھرمٹ جو رسولوں کا
ان سب میں حسیں میرے سرکارؐ نظر آئے

دوسرے مصرع کو پڑھئے اور اس کے انداز بیان پر غور کیجئے، کیا اس سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا کہ رسول اللہ کے علاوہ تمام انبیاء بدشکل یا معمولی شکل و صورت کے تھے۔ اگر یوں کہتے کہ ان سب میں حسین ترین رسول اللہؐ تھے تو بیشک درست ہوتا، لیکن جو لب و لہجہ اس مصرع میں استعمال کیا گیا ہے اس سے یہی مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء حسین نہ تھے۔ حالانکہ مسجد اقصیٰ میں جمع ہونے والے انبیاء میں حضرت یوسفؑ بھی ضرور ہوں گے۔ حیرت ہے کہ ماہر صاحب کا خیال کلام مجید کی اس آیت کی طرف نہیں گیا۔ لا نفرق بین احد من رسلہ اور اس Beuty Contest میں انھوں نے ناحق شناسی سے کام لیا ہے۔

گذارش:۔ فاضل ناقد نے اس تنقیدی عبارت کے آغاز میں جن باتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ تمام باتیں درست ہیں کسی نبی اور رسول کا نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح تقابل کرنا کہ دوسرے نبی کی تحقیر ہوتی ہو۔ بیشک جائز نہیں بلکہ گناہ کی بات ہے۔ مگر انبیاء اور رسولوں کے درمیان درجات کی فضیلت پائی جاتی ہے۔ اور یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ خود اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض (ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے)

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت کا اظہار جائز ہے، اور اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ حضور ہر اعتبار سے افضل الانبیا ہیں۔

حُسنِ یوسف، دمِ عیسٰی، ید بیضا داری
انچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

میرے شعر میں لفظوں کا جو دروبست ہے، اور جس اسلوب کے ساتھ میں نے اپنے مفہوم کو ادا کیا ہے، اُسے سُن کر اور پڑھ کر کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ دوسرے انبیاء جو مسجد اقصیٰ میں جمع تھے وہ معاذ اللہ بدصورت تھے انداز بیان بھی ایسا ہے، جس سے شعر کا یہی مفہوم نکلتا ہے کہ تمام نبیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسین ترین تھے۔

اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے اردو کا ایک جملہ لکھتا ہوں۔

"بھئی! اُس محفل میں بڑے بڑے نوجوان جمع تھے مگر ہمارا دوست طاہر، سب میں حسین نظر آرہا تھا۔"

اس جملہ سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا کہ دوسرے نوجوان بدصورت تھے۔ اس سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ طاہر ان سب میں حسین تھا! مگر فاضل ناقد کے انتباہ کے بعد میرا یہ شعر شائع ہونے والے مجموعہ کلام میں یوں لکھا جائے گا۔

تھا مسجد اقصےٰ میں جو جھرمٹ جو رسولوں کا
ان سب ~~میں~~ سے حسیں میرے سرکار نظر آئے

یعنی اس شعر میں "سے" اور "میں" دونوں لفظ پڑھے جا سکتے ہیں۔

نقد و نظر کے ان نازک آبگینوں سے میں نے انتہائی احتیاط سے گزرنے کی کوشش کی ہے، بہ تقاضائے بشری کسی آبگینہ کو ٹھیس لگ گئی ہو تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

ھندی شاعری نمبر

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ اِسمیں تمام ہندی شعرا کے کلام کا انتخاب ترجمے کے ساتھ درج ہے۔ ساتھ ہی ہندی کے تمام اصناف شعری ان کے موضوعات اور مباحث اور ساتھ ہی اردو شاعری سے تقابل و تبصرہ پر سیر حاصل مقالات ہیں۔

ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت معلوم کرنی ہو تو اردو میں صرف یہی ایک مجموعہ ہے۔ قیمت:۔ ۴ روپے

نگار پاکستان۔ ۳۲۔ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

تھیٹر اسٹیج اور تمثیل کے آغاز کی دلچسپ داستان

(نیاز فتحپوری)

فنِ تمثیل (ڈرامہ) کا آغاز یوروپ کے قرونِ وسطیٰ یا گیارہویں تیرہویں صدی کے درمیان ہوا جس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اس زمانہ میں وہاں ایک جماعت آوارہ گرد شعراء کی پیدا ہوئی جنھیں ٹروبیڈور (Trubador) کہتے تھے۔ اس جماعت نے بہت جلد غیر معمولی شہرت و قبولیت حاصل کر لی اور خصوصیت کے ساتھ عورتوں کا طبقہ اس درجہ مالوف ہوا کہ امراء و ملوک کو بھی اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی طرف سے اطمینان باقی نہ رہا۔ کیونکہ تاریک راتوں میں سیاہ ریشمی لبادے پہن پہن کر وہ خود بھی ان سے ملنے باہر نکل جاتی تھیں اور پوشیدہ طور پر انھیں اپنے حجروں میں بلا لیتی تھیں۔

اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان میں بعض شعراء نہایت اونچے خاندان کے ہوتے تھے اور دوسرے یہ کہ شاعرانہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ان کا وہی مرتبہ تھا جو عہدِ جاہلیت کے شعراء عرب کو حاصل تھا۔ یہ شعراء محض حسن و جمال ہی کی داستانیں نہیں دہراتے تھے بلکہ جذبات شجاعت و حماست بھی ابھارتے تھے۔ چنانچہ اس لحاظ سے ٹالیور کے نام نے تاریخ میں نقش دوام کی حیثیت حاصل کر لی ہے کیونکہ جب انگلستان نے نارمنڈیوں کے خلاف فوج کشی کی تو لشکر کے آگے آگے یہی شاعر تھا اور سب سے پہلے اس نے وار کر کے دشمن کے دو سپاہی ہلاک کر دئے۔

ایک خاص سبب ان شعراء کی اہمیت کا یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں اسباب تفریح کی بھی کمی تھی اور دوسرے ملکوں کے حالات معلوم کرنے کا بھی کوئی معقول ذریعہ حاصل نہ تھا اور چونکہ اس سے یہ دونوں باتیں حاصل ہو جاتی تھیں اس لئے امراء و ملوک کے طبقہ میں بھی ان کو بڑی عزت حاصل تھی۔ اور جب کبھی کوئی جماعت ان شعرا کی پہنچ جاتی تھی تو یوں سمجھئے کہ لوگوں کی عید ہو جاتی تھی۔

ایسا شاعر ہمیشہ ایک طائفہ یا جماعت کی صورت میں سیاحت کیا کرتا تھا۔ یعنی اس کے ساتھ پہلوانی کا فن جاننے والے فنون سپہ گری کے ماہرین، موسیقی کے اساتذہ اور مختلف لہو و لعب کے کاملین بھی رہتے تھے۔ وہ خود تو گھوڑے پر سوار ہو کر چلتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھی اس کے جلو میں پیادہ پا چلتے تھے۔

جب یہ کسی امیر کے قصر یا قلعہ کے پاس پہنچتا تھا تو اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے اپنی آمد کا ڈھنڈورا ہر طرف پٹوا تا تھا۔ اور منادی کرنے والے شاعر کی فصاحت و بلاغت کی تعریفیں کر کر کے لوگوں کے دلوں میں ہلچل ڈال دیتے تھے۔ اس خبر کے سنتے ہی امیر شہر خندق پر پل گرا دیتا تھا اور اس جماعت کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل جاتی تھی ــــ جب وہ شہر میں داخل ہوتے تو امیر کے نمائندے ان کا استقبال کرتے اور ان کے قیام و طعام کا بھی خاطر خواہ خیال رکھتے۔ یہ خبر جب پس پردہ

پہنچتی تھی تو وہاں بھی خاص ہیجان پیدا ہو جاتا تھا اور اپنی زیبائش و آرائش کی تکمیل میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھتیں۔ محض اس امید پر کہ شاعر ان کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو جائے اور کوئی نظم لکھ کر اسے شہرت عوام دے دے اس زمانہ میں خبر رسانی کے ذرائع تو اتنے وسیع نہ تھے کہ ایک جگہ کا حال دوسری جگہ بہ آسانی مشتہر ہو سکے اور لڑکیاں قدرتاً یہ چاہتی تھیں کہ ان کے حسن و جمال کے افسانے دوسرے شہروں اور ملکوں میں پہنچیں تاکہ بہتر سے بہتر شوہر انھیں مل سکے۔ چنانچہ شاعر اس خدمت کو بخوبی انجام دیتا تھا۔ اور اپنے اشعار میں لڑکیوں کے حسن کی تعریف کر کے ملک میں دھوم مچا دیتا تھا گو اس کا معاوضہ شاعر بھی رات کی تنہائیوں میں پوری طرح وصول کر لیتا تھا ـــــ پھر یہ بات ایسی نہ تھی کہ چھپ جاتی اور امیر شہر کو اس کی خبر نہ ہوتی اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ قصر کے اندر انھیں بزم شعر و سخن یا محفل رقص و سرود قائم کرنے کی اجازت نہ ملتی۔ لیکن بہت کم اور کبھی کبھی۔

شاعر کے ساتھ جو جماعت پہلوانوں کی ہوتی تھی وہ دراصل ان بازی گروں کی اولاد تھی جو چھٹی صدی سے قبل اطالیہ کی تماشہ گاہوں میں بکثرت نظر آتے تھے۔ جب شمال یورپ کی وحشی اقوام نے اطالیہ کو فتح کیا تو انھوں نے ان بازیگروں کو بھی دیکھا جو فاتحین کی توہین آمیز نقلیں کیا کرتے تھے اور انھوں نے ان کی تماشہ گاہیں بھی برباد کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بازیگر تمام اکناف یورپ میں منتشر ہو گئے انھیں کی اولاد ان آوارہ گرد شعراء کے ساتھ ہو گئی اور مختلف شہروں میں گھوم پھر کر تماشے دکھانے لگی۔ موجودہ سرکس بھی انھیں کی یادگار ہے۔

ان لوگوں نے Magic Lantern بھی جسے موجودہ تصاویر متحرکہ کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ یہ تماشہ ہمیشہ شام کا کھانا کھانے کے بعد دکھایا جاتا تھا۔ جب حاضرین شراب کے نشے میں چور ہوتے تھے۔ روشنیاں گل کر دی جاتی تھیں اور پردہ کے پیچھے صرف جادو کا فانوس رہتا تھا۔

جماعت کا سردار تماشائیوں سے پوچھتا تھا کیا وہ شیطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دفعتاً ایک عجیب الخلقت انسان کا سایہ دیوار پر نظر آنے لگتا تھا۔ جس کے بڑے بڑے سینگ ہوتے تھے۔ لوگ دیکھ کر ان کی غیر معمولی قوتوں کا یقین کر کے ان سے ڈرنے لگتے تھے۔

اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا جب شاعر اس جماعت سے علیحدہ ہو گیا اور ان بازی گروں کی اخلاقی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ تماشے کے دوران میں لوگوں کی جیبوں سے چیزیں چرانے لگے اور بہت بدنام ہو گئے۔۔ اسی کے ساتھ چونکہ یہ امراء کی بھی بری بری نقلیں کرتے تھے اس لئے ۱۵۷۲ء میں یہ قانون وضع کیا گیا کہ جب تک کوئی باضابطہ اجازت حاصل نہ کرے اس قسم کے تماشے نہیں دکھا سکتا۔

یہ لوگ علاوہ ان شعبدوں کے دواؤں کی بھی تجارت کرتے اور بالکل اسی طرح جیسے آج کل سڑکوں پر بازاری ادویات فروخت کی جاتی ہیں۔ ان کی ترکیب یہ ہوتی تھی کہ مثلاً ایک شخص دفعتاً تماشہ کرتے کرتے تھک کر کرسی پر بیٹھ جاتا اور زور زور سے کھانسنے لگتا۔ اس کے بعد وہ ایک شیشی نکال کر اس کا تیل اپنے گلے پر ملنے لگتا اور کھانسی فوراً دور ہو جاتی معاً اسی وقت انھیں میں کا ایک شخص جو ہجوم میں شامل رہتا تھا باہر نکل کر سامنے آجاتا اور کہتا کہ مجھے بھی کھانسی ہے۔ اور اگر مجھ کو فائدہ ہو جائے تو بے شک میں جانوں گا کہ تمھاری دوا مفید ہے یہ کہہ کہہ کر زور زور سے کھانسنے لگتا لیکن تیل ملتے ہی کھانسی دور ہو جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجمع سے کوئی ایسا شخص سامنے آجاتا کہ وہ زخمی نظر آتا ہے اور اس کے زخموں

سے خون بہہ رہا ہے لیکن دوا استعمال کرتے ہی خون بند ہو جاتا لیکن یہ تمام باتیں بناوٹی ہوتی تھیں۔ کھانسی بھی مصنوعی اور زخم بھی محض دکھاوے کے۔

جب لندن میں "Puritans" کا زور ہوا تو ان بازی گروں کو مجمع عام میں تماشہ کرنے سے روک دیا گیا اور لندن سے باہر ایک عمارت بنادی گئی جس کا نام THEATRE رکھا گیا۔ یہ عمارت صرف دیواروں کا ایک حصار ہوتی تھی جس میں نہ کوئی چھت ہوتی تھی نہ کوئی سایہ دار جگہ۔ اس کے بعد دوسری عمارت تیار کی گئی جس کا نام CURTAIN تھا اور یہ تھی ابتدا یورپ میں STAGE اور ACTORS کی جس کے سلسلے میں بازی گری، متحرک تصاویر، سرکس اور سر بازار ناقص دواؤں کی تجارت بھی ظہور میں آئی اور اب بھی یہ ساری باتیں زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

مولانا نیاز فتحپوری کی اہم کتابیں

من و یزداں — مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اور اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ قیمت:۔ ۷ روپے ۵۰ پیسے

شہوانیات — اس میں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کے میلان شہوانی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت:۔ ۴ روپے ۵۰ پیسے

فراست الید — اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی ساخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، عروج و زوال، موت و حیات وغیرہ پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت:۔ ایک روپیہ

شہاب کی سرگذشت — حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ قیمت:۔ ۲ روپے

تاریخ کے گمشدہ اوراق — حضرت نیاز کے ۲۴ افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے، ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشائے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت۔ ۲ روپے

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ — مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتداء، مذہب کا فلسفہ ارتقاء، مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ قیمت:۔ ایک روپیہ پچھتر پیسے

امیر معاویہ و یزید — مولانا محمود عباسی کی کتاب "خلافت امیر معاویہ و یزید" پر مولانا نیاز فتحپوری کا عالمانہ بے لاگ تبصرہ۔ قیمت:۔ ۵۰ پیسے

نگار پاکستان ۔ ۳۲ ۔ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

باب الاستفسار

(حافظ عباد اللہ فاروقی)

مندرجہ ذیل سوالات کی عقدہ کشائی کر کے ممنون فرمائیے گا۔

سوال نمبر ۱۔ ایران میں عموماً کہنہ حمام کو نئے حمام پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس ضرب المثل سے ظاہر ہے۔

"حکیم و حاکم و حمام کہنہ ـ بابد"

حکیم و حاکم کا پرانا و فرسودہ ہونا تو کار آمد ہو سکتا ہے۔ لیکن حمام کا پرانا اور قدیم ہونا کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

سوال نمبر ۲۔ مشہور ہے کہ ایران میں نوجوان اور حسین لڑکیاں حماموں میں بطور غسالہ کام کیا کرتی تھیں یہ رواج شاید اب مفقود ہو چکا ہے۔ شیخ سعدیؒ کے مندرجہ ذیل اشعار میں لفظ 'محبوب' سے غسالہ ہی مراد لئے گئے ہیں۔ ؎

گلِ خوشبوئے در حمام روزے	رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری	کہ از بوئے دلاویزے تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم	ولیکن مدتے با گُل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد	وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

لیکن خواجہ حافظؒ کا مندرجہ ذیل شعر اس حقیقت کا غماز ہے کہ ایران کے گرم حمام علاوہ حمامی عورتوں کے حسیناؤں کی جولانگاہ رہے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

اگر رفیق شفیقی درست پیماں باش	حریف حجرۂ <u>گرمابۂ</u> وگلستاں باش

اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سوال نمبر ۳۔ فارسی زبان میں لفظ کُلال (بمعنی کمہار) مٹی کے برتن بنانے والا، اور کُلالہ مختلف معنوں میں استعمال ہوتے ہیں (کلالہ بمعنی پیچ دار زلفیں) کیا یہ ایک ہی مصدر کے مشتق ہیں یا ان کے الگ الگ مخرج ہیں؟

یہ سوال اس لئے پوچھا گیا ہے کہ گھنگو نے بالوں کو کمہار کے گھومتے ہوئے برتنوں کے ساتھ ایک خاص مشابہت ہے۔ مثال ؎

آں نافۂ مُراد کہ مے خواستم زغیب	در چینِ زُلفِ آں بتِ مشکیں کلالہ بود	حافظ

زلفِ سیاہ بر پشت چشم و چراغ عالم است | جاں زنسیم دوستت در شکنِ کلالہ باد حافظ
تا خاکِ ترا کوزہ نہ سازند کلالاں | ہرگز بہ لبِ لعلِ نگارے نرسی

(نگار) (۱) حمام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جلد گرم ہو جائے اور اس کے اندر ہر وقت ہلکی سی گرمی پائی جائے اور یہ کیفیت نئے بنے ہوئے حماموں میں نہیں ہوتی بلکہ صرف پرانے حماموں میں پائی جاتی ہے جو زمانۂ دراز سے گرم ہوتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اسی لئے وہ حمام جو زیادہ پرانا ہوتا ہے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔

(۲) حماموں میں جو غسال یا دلاک (بدن ملنے والے) مامور ہوتے تھے وہ عموماً خوشرو نوجوان لڑکے ہوتے تھے۔ لڑکیاں نہیں۔ سعدی نے اپنے قطعہ میں جس محبوب کا ذکر کیا ہے اس سے مراد بھی عورت نہیں بلکہ امرد ہی ہے اور خسرو نے بھی اپنے شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ حمام میں عورتوں سے یہ خدمت ایران میں کبھی نہیں لی گئی۔

(۳) کلال کے معنی عربی و فارسی میں بالکل مختلف ہیں۔ فارسی میں کلال اور کلالہ کے وہی معنی ہیں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں، لیکن عربی میں کلالہ اور کلال کے معنی خستگی اور تھکن کے ہیں۔ علاوہ اس کے کلالہ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس کا نہ باپ ہو نہ کوئی بیٹا۔ علاوہ اس کے دور کے عم زاد بھائی کو بھی کہتے ہیں ——— ان میں باہم گرکوئی اشتقاقی تعلق نہیں پایا جاتا ——— اردو میں کلال شراب کا کاروبار کرنے والے کو کہتے ہیں۔

نیاز نمبر

جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب نے حصہ لیا ہے اس میں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشاپردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری و ادارتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

صفحات:- ۶۲۴ قیمت:- ۸ روپے

نگار پاکستان۔ ۳۲۔ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

منظومات

متاعِ رسوائی

فضا ابن فیضی

میں نے چاہا تھا کہ بازار میں رسوائی کے — آج پاکیزگیٔ لوح و قلم تو نہ بکے
سرِ بازار نہ ہو قلب و نظر کا نیلام — اس طرح ہوش و بصیرت کا بھرم تو نہ بکے
کچھ بڑی شے نہیں ہونٹوں کا تبسم لیکن — آبرو ہے جو محبت کی وہ غم تو نہ بکے
ہے اسی موج سے شاداب مری کشتِ خیال — جل بجھے جسم مگر آنکھ کا نم تو نہ بکے
مفت رسوا تو نہ ہو جیب و گریباں کا وقار — عقل کے ہاتھ جنوں کا چشم و خم تو نہ بکے
ذہن میں جال تو بنتا رہے گیتوں کا طلسم — فن تو زندہ رہے، شاعر کا قلم تو نہ بکے

میری آنکھوں نے اسی بزم میں دیکھا لیکن — کتنے خوابوں کو حقیقت کی تجارت کرتے
میں نے پھولوں کو اسی باغ میں دیکھا اکثر — اپنی ہی نزہت و نکہت کی تجارت کرتے
ہر جگہ مجھ کو ملے ہیں یہی اربابِ خرد — ننگ و ناموسِ بصیرت کی تجارت کرتے
گزرے بازار سے صاحب نظرانِ محفل — فکر و تخئیل کی عظمت کی تجارت کرتے
انتہا یہ ہے کہ آنسوں کو میں نے پایا — اپنے جوہر کی لطافت کی تجارت کرتے

کون سی چیز رہی دستِ ہوس سے محفوظ — چشم و ابرو بکے، خال و لب و رخسار بکے
دام عشوؤں کے گئے، مول اداؤں کا ہوا — لالۂ عارض و سروِ قدِ دلدار بکے
اس ماحول میں اربابِ وفا کے ہاتھوں — عشق کی آن بکی، حسن کے پندار بکے

اپنے ہی مشک کی خوشبو نے دیے انکو فریب
آج بے دام غزالانِ طرحدار بکے

کھو دیا صبح نے خود اپنے اجالوں کا بھرم
رات کے ہاتھ چراغوں کے خریدار بکے

کچھ نہ باقی رہا تہذیبِ جنوں کی خاطر
جیب و دامن بکے، پیراہن و دستار بکے

آدمیت ہے کہ جنسِ سرِ بازار کوئی
لوگ سو بار خریدے گئے، سو بار بکے

ہوئی چوراہوں پہ تقدیسِ محبت نیلام
آج نفرت کے اندھیروں میں حسیں پیار بکے

بڑھ گیا اور ضمیروں کی تجارت کا رواج
ہوا گفتار کا نیلام تو کردار بکے

ہے تصوّر ہی غلط پھول کا خوشبو کے بغیر
زیست خود بک گئی جب زیست کے اقدار بکے

کیا قیامت ہے کہ مل جائیں خریدار اگر
دھڑکنیں دل کی بکیں، نبض کی رفتار بکے

پھر بھی خالی ہی رہا ذہن و نظر کا کشکول
فن کے آثار بکے، فکر کے شہکار بکے

بر سرِ بزم ہوا غالب و اقبال کا مول
اپنے ہی فن کی دکانوں میں یہ فنکار بکے

کیا کہوں میں، ادب و فن کی گزرگاہوں میں
کتنے پاکیزہ خیالات کا نیلام ہوا

یوں چکائی گئی مطرب کے نفس کی قیمت
ساز کے ساتھ ہی نغمات کا نیلام ہوا

وقت نے چھین لی احساس کے ماتھے کی شکن
گرمیِ شعلۂ جذبات کا نیلام ہوا

پی گئی سختیِ حالات قلم کی شبنم
ساقی و جام و خرابات کا نیلام ہوا

ابدیت نہ رہی فن کی حسیں قدروں کی
عشق و مستی کی روایات کا نیلام ہوا

میں نے چاہا تھا کہ بازار میں رسوائی کے
آج پاکیزگیِ لوح و قلم تو نہ بکے

سرِ بازار نہ ہو قلب و نظر کا نیلام
اس طرح ہوش و بصیرت کا بھرم تو نہ بکے

کچھ بڑی شے نہیں ہونٹوں کا تبسم لیکن
آبرو ہے جو محبت کی وہ غم تو نہ بکے

ہے اسی موج سے شاداب مری کشتِ خیال
جل بجھے جسم مگر آنکھ کا نم تو نہ بکے

مفت رسوا تو نہ ہو جیب و گریباں کا وقار
عقل کے ہاتھ جنوں کا چم و خم تو نہ بکے

ذہن میں جال تو بنتا رہے گیتوں کا طلسم
فن تو زندہ رہے۔ شاعر کا قلم تو نہ بکے

"راوی نے کہا" کا ایک حصّہ

(دانش فرازی)

بیاں راوی کا رہتا اور جاری / مگر اک کنج سے یہ شور اُٹھا
ملی ہے خاک کی چٹکی کو پرواز / کھُلا ہے عقدۂ ابرِ مطرّا
نہیں ہے سرحدِ ادراک سے دور / نوا میں ہیں دو عالم کا تقاضا
مگر رمز آشنائے بزمِ فطرت / سنو! مرکز سے اپنے دور پہنچا
کہیں سے دوسری آواز گونجی / کہو قصہ چراغِ انجمن کا
گروہِ سرکشاں کا ذکر چھیڑو / خدا ہوگا کسی گوشے میں تنہا
زمیں اُٹھتی چلی ہے آسماں تک / عجب کیا ہو جو ہمدوشِ ثریا
گرہ کھولی ہے ماہ ضوفشاں نے / اُٹھا جاتا ہے ہر چہرے سے پردا
رہے محمل نشیں کیوں حسن کوئی / ہوئے ہیں قیس چاروں سمت پیدا
معاً اک دل نشیں آواز اُبھری / کسی نے جیسے سازِ عرش چھیڑا
ابھی برہم زنِ بزمِ سکوں ہے / یہ ترتیبِ عناصر کا ہیولا

مگر اس دشتِ امکاں میں ازل سے
خدا معیار ہے فکر و نظر کا

غزل

تابش۔شجاع آبادی

دیارِ دوست میں پہنچا ہوں میں بیتابیٔ دل سے / یہ تھی اک موجِ دریا کی جو ٹکرائی ہے ساحل سے
کسی پر دل کا آنا بھی بلائے ناگہانی ہے / قیامت کیا گزرتی ہے کوئی پوچھے مرے دل سے
نہیں آسان آنسو ضبط کرنا دل اُمنڈنے پر / کہ جوشِ عشق میں آتے ہیں یہ آداب مشکل سے
نثار اے جذبۂ دیوانگیٔ شوقِ بے پایاں / کہ رفتارِ قدم رُکتی نہیں بارِ سلاسل سے

شیخ التکفیر

ابوالمزاح شہباز صدیقی امروہوی

بنام ہر کہ سزاوار و لایق این است

مدرسہ میں جو نظر آتا ہے وہ اک ملا
اس کی صورت سے عیاں ہوتی ہے شانِ جبریل

رخ انور پہ ہے وہ ریش دراز و ابیض
پنجۂ مہر کیا کرتا ہے شانہ جس میں

زینتِ لوحِ جبیں یوں ہے نشانِ سجدہ
جس طرح ناصیۂ ماہ درخشاں پہ کلف

فرقِ اقدس پہ ہے دستارِ فضیلت وہ سفید
گنبدِ تاج محل بھی جسے دیتا ہے خراج

زیب بر ایک عبا ہے وہ طویل اور عریض
جس کے دامن کا ہے داماں قباحت پیوند

دور بیں چشمہ ہے آنکھوں پہ وہ افلاک شگاف
جس سے آتی ہے نظر مملکتِ حور و قصور

ہاتھ میں ہے وہ عصا لین عصائے موسیٰ
جس کی ہر ضرب میں ہے دبدبۂ ضربِ کلیم

پاؤں تک سر سے نظر آتی ہے ہر شئی برّاق
قلب کے زنگ کا احوال خدا ہی جانے

درس و تدریس ہے ہر شام و سحر شغل اس کا
منطق الطیر میں وہ عہد کا اپنے ہے فرید

حلقۂ درس میں اس کے ہیں جو کچھ طالبِ علم
اصطلاحاً جنھیں رزق العلماء کہتے ہیں

ہیں وہ دراصل گلستانِ ارم کے غلماں
کرتے رہتے تھے جو حورانِ جناں سے پیکار

ان کو بھاتی نہ تھی اخلاص و محبت کی فضا
اپنی افتادِ طبیعت سے تھے مجبور غریب

"تھا نہ فردوس مقام جدل و قال اقول
تھی مگر جنگ ان اللہ بندوں کی سرشت"

راس جب روضۂ رضواں کا نہ آیا ماحول
چھوڑ کر خلد بریں ہو گئے دنیا میں مقیم

مدعا یہ ہے کہ لے کر کوئی اعلیٰ ڈگری
مستند مفسدہ پرداز مناظر بن جائیں

اور پھر اپنے فتاویٰ کی شرر باری سے
خرمنِ ملّت اسلام کو سوزاں کر دیں

چھوڑیں ہفتاد و دو ملّت میں نہ ایسا کوئی فرد
داغ سے کفر کے محروم رہے جس کی جبیں

پس بہ استادانہیں طرف. بفیض صحبت
بے پڑھائے ہی بنا دیتا ہے شیخ التکفیر

ایک دن اس کے ادارہ میں ہوا میرا گذر
اور میں نے یہ کہا اس سے باندازِ سوال

دستِ معمار جو بنیاد بر افگن ہو جائے
رو کشِ کاخ ثریا ہو عمارت کیونکر

رہبرِ راہ اگر غیرت رہزن ہو جائے
پہنچے رہرو کوئی منزل پہ سلامت کیونکر

سن کے یہ بات مری اس نے رکھا پیٹ پہ ہاتھ
یعنی بے منتِ گفتار دیا مجھ کو جواب

میں جو ملّت کو پڑھاتا ہوں تنازع کا سبق
راز اس امر میں مضمر ہے بقا کا میری

ہوتی رہتی ہے اگر قوم میں جوتی پیزار
ملتی رہتی ہے پلاؤ کی رکابی مجھ کو

مطبوعات موصولہ

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

حضرت فرید گنج شکر کی سوانح حیات ہے، جسے وحید احمد مسعود نے مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں مولانا ضیاء احمد بدایونی کا مختصر سا پیش لفظ اور بعد ازاں مرتب کا مقدمہ ہے کتاب حضرت گنج شکرؒ کی زندگی و کمالات کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے اور پھر چونکہ وحید احمد مسعود نے اسے خاص شغف و قرینے سے ترتیب دے دیا ہے اور مواد کو مستند و مفصل بنانے میں بڑی جانفشانی و دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ اس لئے یہ کتاب اور بھی قابل مطالعہ ہو گئی ہے۔

فاضل مرتب نے حضرت گنج شکر کی شاعری پر بھی ایک باب قلمبند کیا ہے۔ حضرت فرید گنج شکر کے ملفوظات و اشعار کو اُردو زبان و شاعری کا اولین نمونہ خیال کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ مولوی عبدالحق مرحوم اور حافظ محمود شیرانی جیسے بزرگوں نے بھی حضرت گنج شکر کے اشعار بطور نمونہ نقل کئے ہیں، اگرچہ بعض اہل قلم کو پہلے بھی اِس باب میں اختلاف تھا۔ لیکن زیر نظر کتاب میں مرتب نے مدلل بحث کے ذریعہ اس بات کو پورے طرح واضح کر دیا ہے کہ جو اشعار حضرت گنج شکر سے منسوب کئے گئے ہیں وہ اُن کے نہیں بلکہ اُس نام کے ایک اور بزرگ حضرت ابراہیم کبیر، ملقب بہ فرید ثانی کے ہیں۔ حضرت فرید ثانی کا زمانہ حضرت فرید گنج شکر سے تقریباً دو سو سال بعد کا ہے۔

۲۹۶ صفحات کی یہ کتاب، سفید کاغذ پر صاف ستھری کتاب و طباعت کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے اور چھ روپیہ میں پاک اکڈامی وحید آباد کراچی ۱۸ سے مل سکتی ہے۔

حالی کی اُردو نثر نگاری

ڈاکٹر عبدالقیوم اُستاد شعبۂ اُردو کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر کراچی یونیورسٹی نے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالقیوم یوں تو اُردو زبان و ادب کے سارے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن اُردو نثر کا وہ عہد جس میں سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کے نام آتے ہیں بالخصوص اُن کے مطالعہ کا مرکز رہا ہے۔ سرسید اور اُن کے نیک نفس سوانح نگار، حالی سے اُن کا شغف طبعی اور امتیازی ہے۔ وہ سرسید اور حالی پر اظہار خیال کرتے وقت، تقریر و تحریر دونوں میں صرف وسعتِ مطالعہ و ژرف نگاہی ہی نہیں، بلکہ خاص قسم کے لگاؤ کا ثبوت بھی دیتے ہیں، چنانچہ زیر نظر مقالہ صرف اُس مشقت و جاں سوزی کا نتیجہ نہیں، جو اس قسم کے تحقیقی کاموں میں بہر نوع پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ حاصل ہے اُن کے عمر بھر کے مطالعہ کا، سرسید و حالی سے انس خاص کا اُردو نثر سے گہرے شغف کا اور زبان و ادب سے مسلسل انہماک کا۔ اسی لئے اس میں تحقیق کی وہ بے کیفی نہیں جو پڑھنے والوں کو عموماً منغض کر دیتی ہے بلکہ اس میں موضوع کے تجزیہ و تحلیل کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی چاشنی بھی ہے، ایسی چاشنی جو اس تحقیقی مقالے کو اُردو نثر کی گراں مایہ تصانیف کے زمرے میں لے آتی ہے۔

مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سماجی و سیاسی پس منظر ہے دوسرے میں حالی کی ابتدائی نثری تصنیف کی تفصیل ہے۔ تیسرے میں فن سوانح نگاری اور حالی کی سوانح نگاری پر مدلل بحث ہے، چوتھے میں حالی کی سوانح نگاری کے اثرات و خصوصیات کی تلخیص ہے۔ پانچویں میں حالی کی تنقید نگاری پر محاکمہ ہے، چھٹے باب میں حالی کی مقالہ نگاری اور خطوط نویسی کا جائزہ ہے سا تویں میں حالی اور اُن کے معاصر

نثر نگاروں کا تقابلی مطالعہ ہے، گویا یہ کتاب حالی اور اُن کے عہد کا آئینہ ہے جس میں آپ مصنف اور اس کی شخصیت کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔
سات سو ساٹھ صفحات کی یہ کتاب سفید کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں شائع کی گئی ہے۔ کتاب مجلد ہے اور پندرہ روپیہ میں مجلس ترقی ادب لاہور سے مل سکتی ہے۔

تلامذۂ میر

از۔ امداد صابری۔
ناشر:۔ احقر اکڈامی، جوٹرپال، راولپنڈی۔
صفحات ۱۱۰۔ قیمت سوا روپیہ۔

امداد صابری، برصغیر کی سیاسی وملی تحریکات اور صحافتی تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں یہ دلچسپی اُردو زبان وادب کے لئے فال نیک ثابت ہوئی ہے، اس لئے کہ مولانا کی متعدد کتابیں، جو بظاہر تعلق رکھتی ہیں، تاریخ، سیاسیات اور صحافت سے، اُردو کے باب میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں ان کے ذریعہ بہت سی نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ اور دریافت وتحقیق کے بہت سے نئے دروازے کھلے ہیں۔ زیر نظر کتاب البتہ براہِ راست تعلق رکھتی ہے ہماری ادبی تاریخ سے، پھر چونکہ اس کا تعلق ہے، ناخدائے سخن میر تقی میر اور ان کے تلامذہ سے، اس لئے بلحاظ موضوع کتاب اور بھی اہم ہوجاتی ہے۔

ہر چند کہ اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بعض مقالہ نگاروں نے روشنی ڈالی ہے لیکن اتنی تفصیل سے نہیں۔ تلامذہ میر کے مولف نے یہ کیا ہے کہ قدیم تذکروں سے جو باتیں مل سکتی تھیں وہ یکجا کردی ہیں۔ اگرچہ ان تمام شعرا کے متعلق جن کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے۔ وثوق سے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ میر کے شاگرد تھے، پھر بھی اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ میر پہ کام کرنے والے ڈھونڈیں گے اور ڈھونڈنے والے کچھ نہ کچھ ضرور پاتے ہیں۔

کتاب کی طباعت وکتابت البتہ بہت خراب ہے۔ کاغذ بھی بہت معمولی ہے۔ پڑھتے وقت سخت کوفت ہوتی ہے۔

مجموعہ وصایا اربعہ

مرتب ومترجم۔ محمد ایوب قادری ایم۔ اے۔
ناشر:۔ شاہ ولی اللہ اکڈامی۔ حیدر آباد، پاکستان۔
صفحات ۱۹۲۔ قیمت تین روپے پچھتر پیسے۔
یہ کتاب حسب ذیل مقالات ورسایل کے ترجموں پر مشتمل ہے۔

۱۔ المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیہ۔ ———— از شاہ ولی اللہ دہلوی
۲۔ تصنیف رنگین ———— ″ ″ ″
۳۔ وصیت نامہ ———— از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی
۴۔ نصیحت نامہ ———— از شاہ اہل اللہ دہلوی

یہ رسائل مسائل دینی اور امور مذہبی سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک عرصہ سے نایاب تھے۔ فارسی میں ہونے کی وجہ سے عام قارئین کے لئے ان سے استفادہ کرنا بھی مشکل تھا۔ محمد ایوب قادری نے جنھیں تحقیقی کاموں کا خاص ذوق ہے، بڑی محنت سے انھیں یکجا کیا اور مفید تعلیقات وحواشی کے ساتھ منظر عام پر لے آئے۔ ابتدا میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جو رسائل کے مصنفین کے حالات وکمالات سے بحث کرتا ہے۔ اردو ترجمہ حد درجہ سادہ اور رواں ہے، عام وخاص دونوں یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن مرتب نے ترجمہ کے ساتھ چونکہ فارسی متن بھی دیدیا ہے اس لئے خواص کے لئے اصل سے براہ راست استفادہ کا موقع بھی حاصل ہے۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ قیمت البتہ زیادہ ہے۔

خلش

مجموعہ ہے سیفی پریمی کی غزلوں اور نظموں کا۔

طباعت و اشاعت کی آسانی کے سبب ان دنوں جو شعری مجموعے منظر عام پر آ رہے ہیں وہ عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں عروض و قافیہ کی پابندی اور زبان کو قواعد کے مطابق پڑھنے ہی کو شاعری سمجھا جاتا ہے، دوسرے وہ جن میں زبان و بیان اور عروض و قافیہ کی پابندیوں سے یکسر بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور جدت کے نام پر صد درجہ ابہام و اشکال کو کمال فن خیال کیا جاتا ہے، تیسرے وہ جن میں زبان و خیال دونوں کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے اور ان کے خوبصورت و موثر امتزاج کو شاعری کی شرط اولین سمجھا جاتا ہے۔ سیفی پریمی کا مجموعہ کلام خلش آخری قسم کے شعری مجموعوں میں آتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں جدت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی ساری پابندیوں اور نزاکتوں کا احساس ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ سیفی پریمی ادب خصوصاً شاعری میں اظہار و ابلاغ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شاعر کا تجربہ خواہ کتنا ہی انفرادی اور اچھوتا کیوں نہ ہو، مکمل اظہار کی صورت ہاتھ آئے بغیر وہ ادب کا جز نہیں بنتا اور مکمل اظہار کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نے صرف یہ بیان کیا ہو کہ کسی واقعہ یا چیز کی کیا نوعیت ہے بلکہ یہ بھی بیان کیا ہو اس نے اسے کس طرح اور کتنی شدت سے محسوس کیا ہے۔ شاعری کی اس بنیادی شرط یا وصف کا احساس خلش میں نظر آتا ہے۔ اور یہی وصف ہم سے کتاب کے مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔

کتاب دو روپیہ میں سروج اکیڈمی دہلی اور ظفر منزل جامعہ نگر دہلی سے مل سکتی ہے۔

العلیم

مدیرہ:- ڈاکٹر فریدہ احمد۔ ایم۔ اے (ع۔ ب)

العلیم کا تازہ شمارہ بابت اگست ۱۹۶۵ء پیش نظر ہے۔ ایک سال کے اندر یہ ماہانہ پرچہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی نظر سے یہ برابر گزرتا رہا ہے۔ ڈاکٹر فریدہ احمد جن کی ادارت و نگرانی میں یہ پرچہ نکلتا ہے، ایک ایسے باپ کی بیٹی ہیں جنھوں نے نہ صرف برصغیر، بلکہ بیرونجات میں بھی علم و ادب کا چراغ روشن کیا ہے۔ میری مراد حضرت علیم صدیقی میرٹھی مرحوم سے ہے۔ "العلیم" ان کی علمی و ادبی روایات کو جاری رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

محترمہ فریدہ احمد نے "العلیم" کو بہتر سے بہتر بنانے میں بڑے سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ بظاہر یہ پرچہ خواتین کے لئے مخصوص ہے لیکن مضامین کے تنوع نے اسے عام و خاص سب کے لئے مفید بنا دیا ہے۔ صرف یہی نہیں، طباعت و کتابت کو روز بروز معیاری بنایا جا رہا ہے بلکہ مواد کے اعتبار سے بھی یہ پرچہ، معاصر پرچوں میں خصوصیت و امتیاز رکھتا ہے، اس لئے یقین ہے کہ اس کی مقبولیت بڑھتی رہے گی۔

۴۰ صفحات کا یہ پرچہ، ایک روپیہ میں شہر کی ہر بک اسٹال سے مل سکتا ہے۔ سالانہ خریدار دس روپیہ میں بارہ پرچے حاصل کر سکتے ہیں۔

اقبال نمبر

جس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوارِ شاعری۔ اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ غزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت:- تین روپے

نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

نور الہدیٰ مدنی قرآن مجید معریٰ عکسی

یُوں تو بے شمار قرآن مجید اب تک طبع ہو چکے ہیں لیکن ہم نے نورُ الہدیٰ قرآن مجید میں آٹھ صفحات کا رنگین ضروری ضمیمہ شامل کیا ہے جس میں بیشمار مفید معلُومات مثلاً آدابِ تلاوت، رموزِ اوقاف، تجوید قرأۃ، قرآن کی بعض سُورتوں کے نقش، فالنامہ و اعمالِ قرآنی کا مزید اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے اسکی اہمیت بیحد بڑھ گئی ہے اور دیگر مطابع کے قرآن مجید سے بیحد نمایاں و ممتاز ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر خصوصیات درج ذیل ہیں:— (۱) اغلاط سے پاک (۲) ہر اعراب اپنے صحیح مقام پر (۳) علامہ سجاوندیؒ کے رموزِ اوقاف کے مُطابق (۴) ہر سطر کے درمیان میں لائن، ہر حرف جُدا واضح اور غیر مبہم جس سے پڑھنے والے کو بیحد سہولت ہوتی ہے۔ آنکھوں میں نُور اور دل میں سُرور پیدا ہوتا ہے (۵) کتابت بیحد صاف، خوشخط اور جلی (۶) طباعت کی رنگینیوں سے آراستہ (۷) ہر صفحہ پر خوشنما بیل (۸) ٹائٹل دیدہ زیب سہ رنگہ آرٹ پیپر، (۹) جلد مضبُوط بائنڈنگ کلاتھ، سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۷۴۰ صفحات۔

اِن تمام خوبیوں کے باوجود ہدیہ اس قدر کم اور رعایتی ہے کہ ہر معمُولی حیثیت کا آدمی بہ سہولت خرید سکے۔

ہدیہ قسم اوّل گلیز کاغذ مجلّد آٹھ روپے پچاس پیسے

ہدیہ قسم دوم رنگین کاغذ مجلّد آٹھ روپے

ہدیہ قسم سوم میکانیکل کاغذ مجلّد سات روپے پچاس پیسے

سیٹ علیحدٰہ علیحدٰہ سپارے مجلّد کامل اٹھارہ روپے

سیٹ علیحدہ علیحدہ سپارے رنگین ٹائٹل والے نو روپے

آدابِ تلاوتِ قرآن

[illegible]

تلاوتِ قرآن مجید ہر مُسلمان پر فرض ہے اور سب کرتے ہیں لیکن آدابِ تلاوت کا لحاظ رکھے بغیر تلاوت کرنے سے جو گناہ ہوتا ہے وہ تحریر نہیں کیا جا سکتا، اِسی ضرورت کے پیشِ نظر حضرت مُفتی صاحب نے اِس نازک مسئلے کو انتہائی محنت سے مُستند و محققانہ انداز میں سپردِ قلم کیا ہے جس سے واقف ہونا ہر مُسلمان کا ایمانی فریضہ ہے تاکہ تلاوت کے ثواب سے کماحقہٗ استفادہ کیا جا سکے۔ کتابت و طباعت خوشخط و معیاری ہے ؎

کاغذ عُمدہ گلیز مجلّد مع حسین گرد پوش، قیمت دو روپے پچاس پیسے ؎

رھنمائے حرمین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ مشہُور محل میکلوڈ روڈ کراچی

فضائلِ حج

حج دینِ اسلام کا ایک رُکن ہے، اسکی فضیلتیں کیا ہیں؟ قرآن کریم نے اس بارے میں کیا ارشاد کیا ہے اور احادیثِ نبوی سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ فضائلِ حج میں حضرت علاّمہ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث نے انتہائی مستند و محققانہ انداز میں تحریر فرمائے ہیں۔ اس کا مطالعہ عازمینِ حج کیلئے خصوصاً و عام مسلمانوں کیلئے عموماً بیحد ضروری ہے۔ کاغذ گلیز عمدہ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۴۴ صفحات کتابت و طباعت عمدہ و معیاری، دو رنگہ حسین سرورق

(قیمت چار روپے)

اطیب البیان (اردو) — تقویۃ الایمان

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی کتاب تقویت الایمان جو درحقیقت عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا چربہ ہے، اسکی پیدا کردہ ضلالت کو مسلمانوں سے دُور کرنے کیلئے حضرت مولانا محمد نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے اسکی اہمیت پڑھنے سے ظاہر ہوگی ہر مسلمان کیلئے اسکا مطالعہ بیحد ضروری ہے، کتابت و طباعت انتہائی خوشخط و معیاری ہے۔ کاغذ عمدہ گلیز دو رنگہ حسین سرورق، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۰۰ صفحات، قیمت چار روپے

سوانح کربلا

عالمِ بے بدل حضرت مولانا محمد نعیم الدین صاحب مُراد آبادی اپنی اس بےنظیر تصنیف میں اسلام کو زندہ کرنے والا حق و باطل کا وہ عظیم معرکہ جو پوری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے جسکو دیکھکر کائنات لرز گئی، جسکو پڑھکر آج بھی دل لرز جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں انتہائی مستند و محققانہ انداز میں بحث فرمائی ہے، قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ کتابت و طباعت خوشخط و معیاری سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۴۴ صفحات، سہ رنگہ حسین سرورق قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

رہنمائے دین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

مدنی اصلی بہشتی زیور مکمل

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف بہشتی زیور

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ ۱- دین کیا ہے ۲- دُنیا میں کس طرح رہنا چاہیئے ۳- ماں باپ کے حقوق کیا ہیں ۴- بیوی کے حقوق کیا ہیں ۵- بچّوں کی تربیت کس طرح ہونی چاہیئے ۶- شوہر کے حقوق کیا ہیں- ۷- اولاد کے حقوق کیا ہیں ۸- بیاہ شادی پر اسلام کن رسومات کی اجازت دیتا ہے ۹- دُنیاوی بیماریوں کا آپ خود کس طرح علاج کر سکتے ہیں ۱۰- اسلامی آداب اخلاق کیا ہیں تو مدنی بہشتی زیور کا مطالعہ کیجئے جس میں ایسی سیکڑوں باتیں زندگی میں قدم قدم پر آپ کی رہنمائی کریں گی۔ یہ ایسی کتاب ہے جو باپ، بیٹوں، بھائی، بہنوں، بیویوں، شوہروں، اولاد اور والدین سب کے لئے یکساں مفید ہے۔

ہم نے درج ذیل خوبیوں کے ساتھ شائع کی ہے:- (۱) کتابت انتہائی خوشخط (۲) آفسٹ کی روح پرور دیدہ زیب طباعت (۳) ہر صفحے پر خوشنما باڈر (۴) سرورق دو رنگہ دیدہ زیب آرٹ پیپر (۵) جلد مضبوط بائنڈنگ کلاتھ (۶) سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ ضخامت ۸۰۴ صفحات :

ایسی کتنی ہی گوناگوں خوبیوں کے باوجود ہدیہ انتہائی رعایتی و مناسب مجلد چھ روپے پچاس پیسے :

طلسمات و عملیات قرآنی

از مولوی محمد ابراہیم صاحب رہبر دہلوی

حضرت مولوی صاحب کی ایسی مشہور و قابل قدر تصنیف ہے جو زندگی کی ہر مشکل میں آپ کی مدد کرے گی۔ فاضل مصنف نے قرآن کریم کی سورتوں کے خواص و عملیات مستند طور پر درج فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کیلئے بیحد مفید و موجب ثواب ہے۔ آج ہی طلب فرماکر دینی و دنیوی فائدے حاصل کریں۔ کتابت و طباعت خوشخط و معیاری، کاغذ میکانیکل گلیز سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ ضخامت ۱۸۴ صفحات، سرورق دو رنگہ انتہائی خوبصورت، ہدیہ دو روپے پچیس پیسے

رہنمائے حرمین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور منزل میکلوڈ روڈ کراچی

حدائقِ بخشش

اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خان صاحبؒ بریلوی کا نعتیہ دیوان جس کا ہر ہر لفظ دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ ایک محبت بھرے عاشقِ رسولؐ کے دل کی پکار ایک عظیم انسان کا نذرانۂ عقیدت، وہ نعتیں جو آپکے دل کو محبتِ رسولؐ سے بھریں گی ہم نے جلی کتابت و خوبصورت طباعت سے شائع کیا ہے۔ چہار رنگہ خوبصورت سرورق نے خوبصورتی میں مزید چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سائز $\frac{27 \times 17}{8}$ ضخامت ۲۲۰ صفحات ؛

قیمت :۔ مجلد قسم اوّل تین روپے ؛ قسم دوم مجلد دو روپیہ پچیس پیسے (علاوہ محصولڈاک)

حیاتُ المسلمین

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی اس بےنظیر تصنیف میں نوّے آیاتِ قرآنی اور تین سو چالیس سے زائد احادیث جن سے رہِ حیات کے موڑ پر رہنمائی حاصل ہوتی ہے جمع فرما دی ہیں تاکہ لوگوں کو آسانی سے معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں کی زندگی کسطرح گذرنی چاہیئے ہر مسلمان کیلئے اسکا مطالعہ بیحد ضروری ہے تاکہ اسکی رہنمائی سے اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکے۔ کاغذ عمدہ گلیز۔ کتابت و طباعت انتہائی خوشخط و دیدہ زیب، سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ ضخامت ۳۰۴ صفحات، دو رنگہ حسین سرورق، قیمت :۔ تین روپے ؛ ؛

خطباتُ الاحکام مترجم

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے نماز جمعہ و عیدین کے خطبے جو عربی میں ہوتے ہیں ان کا عام فہم و سلیس اردو ترجمہ مرتب کر دیا ہے تاکہ ہر مسلمان ان خطبوں کا مطلب سمجھ سکے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کا عالم، مولوی مفتی و ہر مسلمان سب کے پاس اس کا ہونا ضروری ہے ؛

کاغذ عمدہ گلیز۔ کتابت و طباعت انتہائی خوبصورت و دیدہ زیب۔ سرورق حسین سائز $\frac{26 \times 20}{8}$ ضخامت :۔ ۱۹۶ صفحات ؛ قیمت :۔ دو روپے پچاس پیسے ؛

داستانِ یوسف

تصنیف :۔ مولوی محمد اسحٰق دہلوی

وہ داستان جس کو قرآن کریم میں اللہ پاک نے بیان فرمایا، وہ حقیقت جو ایک صالح انسان اور مردِ مومن کا کردار پیش کرتی ہے ایسی دلچسپ کہ پوری کتاب پڑھے بغیر چھوڑنے کو دل نہ چاہے فحش ناولوں اور رومانی داستانوں کے اس دور میں سب سے زیادہ دلچسپ اور پاک و صاف زبان میں تحریر کی ہوئی حضرت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی تصنیف جو ہر مسلمان کیلئے قابلِ مطالعہ ہے۔ کتابت و طباعت خوشخط و دیدہ زیب، سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ ضخامت ۴۰۰ صفحات، ٹائٹل دو رنگہ قیمت :۔ چار روپے ؛

رہنمائے دین مفت طلب کیجیئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

پُر اعتماد
زیبائش کیلئے

ڈائمنڈ

پارچہ جات کا انتخاب کیجیے

* ساٹن
* لیڈی ہملٹن
* پپلس جارجٹ
* بروکیڈ
* نائیلون وغیرہ وغیرہ

ڈائمنڈ سلک ملز لمیٹڈ

فیکٹری ۲۸/اے ایس.آئی.ٹی.ای - کراچی - فون ۷۹۰۵۴

Asiatic

DS/1

... روشنی پھیلتی ہے۔ زندگی کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ آپ کامیابی کی منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں روپیہ کی اہمیت بھی اپنا مقام رکھتی ہے۔

پس انداز کی ہوئی رقم کام آتی ہے۔ خاص طور سے ناسازگار حالات میں۔ پابندی سے کچھ نہ کچھ بچاتے رہیئے۔ ہماری نزدیک ترین شاخ سے رجوع کیجیے اور آج ہی سیونگ اکاؤنٹ کھولیے۔

دی مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس: کراچی

ایس. مصطفےٰ اسمٰعیل جنرل منیجر

JWT 65